سعادت حسن منٹو

حیات اور افسانے

ڈاکٹر فرزانہ اسلم

سعادت حسن منٹو

حیات اور افسانے

سعادت حسن منٹو

حیات اور افسانے

ڈاکٹر فرزانہ اسلم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

© جملہ حقوق بحقِ مصنفہ محفوظ!

SAADAT HASAN MANTO

HAYAT AUR AFSANE

by

Dr. Farzana Aslam

Year of Ist Edition 2009
ISBN 978-81-8223-486-4
Price Rs. 550/-(Library Edition)

نام کتاب : سعادت حسن منٹو: حیات اور افسانے
مصنفہ : ڈاکٹر فرزانہ اسلم
سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۰۹ء
قیمت : ۵۵۰ روپے (لائبریری ایڈیشن)
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

گراں قدر والدین

سید رضا امام رضوی

اور

بیگم احمدی خاتون

کے نام

جنھوں نے مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا

☆☆

ترتیب

☆ حرفِ اوّل 9

☆ منٹو — حیات اور کارنامے 11

☆ منٹو — پس منظر اور عہد 25

☆ ماقبل منٹو — اردو افسانہ 47

☆ عہد منٹو — رجحانات و میلانات 54

☆ منٹو کا فن — تنقیدی جائزہ 65

☆ منٹو کی انفرادیت 103

منٹو کے منتخب افسانے 133

1۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ 135

2۔ ٹھنڈا گوشت 142

3۔ ہتک 148

4۔ موذیل 167

5۔ نیا قانون 188

6۔ کالی شلوار 198

7۔ بُو 212

8۔ کھول دو 218

9۔ بابو گوپی ناتھ 222

10۔ جی آیا صاحب 236
11۔ پھندنے 244
12۔ دس روپے 252
13۔ ممی 265
14۔ اللہ دِتا 301
15۔ شانتی 308
☆ کتابیات 317
☆ رسائل 320

☆☆

حرفِ اوّل

اردو ادب بالخصوص مختصر افسانے کی دنیا میں منٹو ایک بڑا نام ہے۔ اس کی انفرادیت اس کی شخصیت اور ذات کے اس داخلی جذبے میں مضمر ہے جو انتہائی نرم دل اور دردمند ہے اور سماج کے ملعون و معتوب لوگوں کو سینے سے لگاتا ہے اور اس کی داستان زندگی قلمبند کرتا ہے۔

منٹو بدنام زمانہ، بددماغ اور کج رو انسان ہے جس کی بددماغی میں بھی فرزانگی کی جھلک ہے۔ اس کی کج روی اور کج ادائی میں زندگی کی مختلف جہتیں پنہاں ہیں۔ انسان اپنی جن کمزوریوں سے گریزاں ہوتا ہے وہ ان کو ہی آئینہ بنا کر اس کے سامنے کر دیتا ہے اور ہم محجوب و شرمسار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ایک پاگل بھی اپنی زمین کی مٹی کی سوندھی خوشبو کو اپنی سانسوں میں جذب کر لیتا ہے۔ ایک پرلے درجے کا عیاش اور اوباش آدمی بھی اپنے اندر پدرانہ ذمے داریوں کو محسوس کرتا ہے اور چکلے میں رہنے والی عورت کو بھی اکثر اپنی ہتک کا احساس کچوکے لگاتا ہے۔ قاتل اور پاکٹ مار بھی پاکباز اور رحم دل ہو سکتا ہے تو دوسری طرف شریف اور عزت دار لوگ بھی ‘‘ٹھنڈا گوشت’’ اور ‘‘کھول دو’’ جیسی کہانیوں کے کردار ہو سکتے ہیں۔

منٹو، کرشن چندر، عصمت اور راجندر سنگھ بیدی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اس ایوان کے اہم ستون کی حیثیت رہی ان کی۔ مگر کرشن چندر کے علاوہ ان کے یہاں ادب برائے زندگی میں پروپگنڈے کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک طرف کرشن چندر کی رومانیت اور دوسری طرف بیدی کی سلجھی ہوئی صاف ستھری زندگی سے بھرپور تحریر۔ ادھر عصمت کی بامحاورہ رواں زبان ہے اور منٹو کے چھوٹے چھوٹے طنز سے بھرپور زندہ جملے، جن میں

زندگی کی حرارت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مجھے منٹو کی انھی کج ادائیوں نے ان کی طرف راغب کیا اور میں ایک بہت ہی پر خار اور کٹھن راستے پر چل نکلی۔ ان کی کہانیاں ملعون و معتوب ہوئیں اور انھیں مردود قرار دیا گیا۔ مقدمات چلے اور ان کی زندگی میں بہت ساری دقتیں اور الجھنیں پیدا ہوئیں۔ زندگی کے ابتدائی دنوں سے ہی انھوں نے جن حالات کا سامنا کیا وہ عمر بھر ان سے پیچھا نہ چھڑا سکے اور پوری زندگی پر ایک یاس زدہ کیفیت کا کہرا چھایا رہا۔ والد کی سخت مزاجی اور والدہ کا انتہائی شفیق و مہربان ہونا زندگی کے سکے کے دو رخ تھے جو ان کی فطرت میں پوری طرح ضم ہو گئے تھے۔ ایک منٹو نہایت رحم دل، مخلص اور دردمند تھا تو دوسرا انتہائی سرپھرا اور سفاک جس کے غصے سے لوگ کانپتے تھے اور خائف بھی۔

میں نے اپنے مقالے کے پہلے باب میں ان کی پیدائش، نشو و نما اور حالات زندگی کو پیش کیا ہے۔ دوسرے باب میں ان کے فن کے پس منظر اور ماحول کا جائزہ لیا ہے۔ تیسرے باب میں منٹو سے قبل اردو افسانوں کے سفر اور ارتقائی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں چوتھے باب میں اس عہد کے مختلف ادبی رجحان اور دبستان زیر بحث آئے ہیں۔ پانچوں اور آخری باب منٹو کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ اور اس کی انفرادیت پیش کرتا ہے چوں کہ پیش نظر کتاب میرا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ لہٰذا رہ نما اصولوں سے انحراف ممکن نہیں تھا اور نہ ہی ایسی آزادی کہ ان قید و بند کی زنجیروں کو میں کاٹ دیتی۔ لہٰذا آپ کو شاید یہ احساس ہو کہ میں نے اسی پرانی لیکھ پر چلنے کا کام کیا ہے جو میرے پیش رو ناقدین نے کیا ہے اور جو یونیورسٹیوں سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں آپ کو تازگی اور ندرت کا فقدان نظر آئے گا۔

مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس ہے تاہم اگر اس میں کوئی ایسا نکتہ پیش کیا گیا ہو جس کی نشان دہی اس سے قبل کبھی کسی نے نہیں کی ہے تو یقیناً میرے لیے اطمینان کا باعث ہوگا۔

فرزانہ اسلم

☆☆

منٹو۔ حیات اور کارنامے

منٹو بھی جواہر لال نہرو اور اقبال کی طرح کشمیری پنڈت تھے۔ عرصے سے ان کا خاندان امرتسر میں آباد تھا۔ منٹو ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء سمبرالہ (موجودہ مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ امرتسر کے کوچۂ وکیلاں میں منٹو کا مکان تھا۔ منٹو کے والد منصف غلام حسین نے دو شادیاں کی تھیں۔ منٹو کی والدہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔

''منصف صاحب نے اپنی پہلی اہلیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت پر اتنی توجہ کی کہ ان کی وفات کے بعد چھوٹی بیگم اور ان کی اولاد — سعادت اور اس کی بڑی بہن ناصرہ اقبال کے لیے کچھ باقی نہ بچا، تلخ یادوں کے سوا''[۱]

سعادت حسن منٹو — بقول منٹو، ''منٹو کشمیری زبان میں ترازو کو کہتے ہیں''۔ منٹو کو فخر تھا کہ دولت اس کے آباواجداد کے یہاں ترازو سے تلتی تھی۔ اس رعایت سے سعادت کے ساتھ منٹو جوڑ دیا گیا۔

علی گڑھ اسٹیشن پر طلبا کے سکریٹری سردار خاں نے جب سعادت کے ساتھ منٹو سنا تو ازراہ مذاق پوچھا — ''لارڈ منٹو تمھارا کون لگتا ہے؟''

''ہمارا دادا'' منٹو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ شاید اس لیے قیاس آرائی ہوتی ہے کہ لارڈ منٹو سے متاثر ہو کر اقارب نے منٹو کو پیار سے منٹو کہا ہوگا۔ (شاید یہ بھی سچ ہو اور وہ بھی)

منٹو ہندو سبھا کالج امرتسر میں جب پڑھتے تھے تب ''ٹامی'' کے نام سے مشہور تھے۔ منٹو کو ہمیشہ خود کو منفرد بنا کر پیش کرنا پسند تھا۔ اس لیے کبھی سلیپنگ سوٹ میں بھی کالج

---

[۱] نقوش۔ منٹو نمبر صفہ ۳۵۲

چلے آتے تھے۔ بچے ہوئے وقت میں منٹو کا پتنگ اڑانا خاص مشغلہ تھا اور والد کے خوف سے کوٹھے پر سے کود کر بھاگ جانا ادنیٰ سے بات تھی۔ منٹو کے والد بہت سخت مزاج تھے۔ والد کی سختی نے ابتدا ہی سے منٹو میں باغیانہ عناصر کو فروغ دیا۔ منٹو نے بچپن ہی سے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا اور اپنے لیے نئی راہ تلاش کرنی شروع کر دی تھی۔ علی گڑھ، لاہور، امرت سر، بمبئی اور دہلی، ان مقامات نے منٹو کی زندگی کے مختلف رنگ دیکھے ہیں۔ بقول کرشن چندر:

> "روسی ادب کا پرستار منٹو چینی ادب کا شیدا منٹو، تلخی اور یاسیت کا شکار منٹو، گمنام منٹو، بدنام منٹو، بھٹیار خانوں، شراب خانوں اور پھر قہوہ خانوں میں جانے والا منٹو اور گھریلو منٹو محبت کرنے والا منٹو، دوستوں کی مدد کرنے والا منٹو، ترشی اور تلخی کو مٹھاس میں سونے والا منٹو، اردو کا معروف ترین ادیب منٹو، ان مقامات نے ہر رنگ میں منٹو کو دیکھا ہے اور منٹو نے بھی ان مقامات کو خوب دیکھا ہے۔ منٹو نے زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک موی شمع کی طرح پگھلایا ہے۔ وہ اردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو خود گھول کر پیا ہے اور پھر اس کے ذائقے کو اس کے رنگ کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ لوگ بد کتے ہیں، ڈرتے ہیں مگر اس کے مشاہدے کی حقیقت اور اس کے ادراک کی سچائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ زہر کھانے سے اگر شنکر کا گلا نیلا ہو گیا تھا تو منٹو نے بھی اپنی صحت گنوائی۔ اس کی زندگی انجکشنوں کی محتاج ہو کر رہ گئی۔ یہ زہر منٹو ہی پی سکتا تھا اور کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا دماغ چل جاتا مگر منٹو کے دماغ نے زہر کو بھی ہضم کر لیا۔ ان درویشوں کی طرح جو پہلے گانجے سے شروع کرتے ہیں اور آخر میں سنکھیا کھانے لگتے ہیں اور سانپوں سے اپنی زبان ڈسوانے لگتے ہیں۔ منٹو کے ادب کی تیزی اور تندی اور اس کی زبان کی نشتر زنی اس امر کی آئینہ داری کرتی ہے کہ منٹو کا فقر آخری منزل پر پہنچ چکا تھا۔"[1]

---

[1] سعادت حسن منٹو انتخاب از کرشن چندر

منٹو کی زندگی ایک مستقل دوڑ تھی۔ منٹو قلم کی جگہ اکثر پنسل کی ٹائپ رائٹر استعمال کرتے تھے۔ کسی قسم کا شور و غل ان کی چلتی پنسل کو روک نہ سکتا تھا۔ ریڈیو کی ملازمت کے وقت کرشن چندر یا جاوید پوچھتے: ''حضرت، تمہاری نثریا کہانی کے لیے کون سا نام لکھوں؟'' ''کوئی بھی'' منٹو بے اعتنائی سے جواب دیتے اور چند گھنٹے پہلے بتائے ہوئے عنوان پر کہانی تیار ہو جاتی۔ اگر ڈرامے ہوتے تو بھی اور کہانی ہوتی تو بھی۔ اور ان کی تکنیک پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کہانیوں کے تابع نہ تھے، بلکہ کہانیاں ان کی تابع تھیں۔ یہ صفت بڑے فنکار اور عظیم خالق کے یہاں ہوتی ہے۔

منٹو کا کمرہ جو ''دارالاحمر'' کے نام سے مشہور تھا، یہی منٹو کا دارالمطالعہ بھی تھا۔

> ''منٹو نے اپنے مضامین میں اس کمرے کو اسی نام سے موسوم کیا ہے[1]''

کتابیں الماری میں بھری پڑی تھیں اور جو بقیہ تھیں وہ ٹیبل پر دیوار کے سہارے پڑی تھیں۔ آتش داں کے اوپر بھگت سنگھ کا مجسمہ رکھا تھا۔ بچپن میں منٹو کو سینما کی ایکٹروسوں کی تصویروں کے جمع کرنے کا ایک خبط تھا اور وہ اپنے یہاں چند دوستوں کے ساتھ صرف ایکٹریوں کی پنڈلیوں اور جسم کے مختلف حصوں کے بارے میں گفتگو کرتے لیکن خلیفہ باری علیگ سے ملاقات کے بعد منٹو میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی اور اب وہاں فلمی ستاروں کی بجائے ادب و انقلاب پر بحث ہوتی۔ گہرے سانولے رنگ کے باری صاحب کارلائل اور گبن کے انداز میں گفتگو کرتے اور تین نوجوانوں کے تمتماتے ہوئے چہرے، اس کی تاثیر سخن کے شاہد ہوتے۔ کمرے کی فضا، ایکٹریسوں کے قصیدے کی بجائے والٹیر، روسو، ڈانٹن، مارکس، لینن، اسٹالین اور گورکی کے تذکروں سے گونج رہی ہوتی۔ ان کے مریدوں کے نام سعادت حسن منٹو، حسن عباسی، اور ابو سعید قریشی تھے۔ اور کچھ ہی دنوں کے اندر ''دارالاحمر'' میں وکٹر ہیوگو، لارڈ لیٹن، گورکی، چیخوف، پوشکن، سلوک، گوگول، دوستوسکی، اندریف اوسکر وائلڈ اور موپاساں کی کتابیں نظر آنے لگیں۔ اسی زمانے میں سعادت حسن منٹو نے ''لاسٹ ڈیز آف اے کانڈیمنڈ'' کا ترجمہ ''سرگزشت اسیر'' کے عنوان سے کیا۔ یہ ڈراما روس کی دہشت پسندوں اور نراجیوں

---

[1] سعادت حسن منٹو، محمد محسن ص۹

کی سرگرمیوں سے متعلق تھا جن کے پاس ہر قسم کے ہتھیار تھے۔ چنانچہ جب اس کے اشتہار شہر کی دیواروں پر نظر آئے تو لوگوں کو مستبد حکمرانوں کے عبرت ناک انجام اور صدائے انتقام روس کے گلی کوچوں میں دی گئی اور زاریت کے تابوت میں آخری کیل گاڑی گئی تو کوچۂ وکیلاں میں بھگت سنگھ اور دت کے ان چیلوں کے بارے میں پوچھ گچھ شروع ہوئی جو امرتسر کے گلی کوچوں میں ماسکو کا ناٹک کھیلنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں انگریز کی شہنشاہیت کے خاتمے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن بچوں کا کھیل کہہ کر پولس کے سفید پوشوں کو لوٹا دیا گیا۔ منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کا افسانہ ''تماشا'' انھی ہی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔ منٹو اس زمانے کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''اب سوچا جائے کہ اس زمانے کی یہ حرکتیں چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت یہ کھلونے عظیم الجثہ اور قوی ہیکل تھے۔ ان سے پنجہ لڑانا گویا کسی دیو سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرت سر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اپنے جوش کے...... کا بھی صحیح علم نہ تھا۔''

یہ صحیح ہے کہ باری صاحب بزدل نہ ہوتے تو ''دارالاحمر'' کے آتش دان پر رکھے ہوئے بھگت سنگھ کے بت کے سائے میں چار ایسے بچے کھیل رہے ہوتے جن کے مجسمے ڈانٹن، روس پیری، لینن کی گیلری میں کھڑے ہوتے۔

تماشا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ ''بچوں کا کھیل'' ابھی جاری تھا۔ پندرہ دن غائب رہنے کے بعد ویرا کے پروڈیوسر باری صاحب پھر آموجود ہوئے۔ اب انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ''خلق'' نکالا تھا۔ منٹو کا افسانہ ''تماشا'' خلق کے پہلے شمارے میں شامل تھا۔ منٹو نے مارے ڈر کے اپنے افسانے کے مصنف کا اعلان نہ کیا۔ لیکن ''خلق'' اپنے پہلے ہی شمارے کے بعد

مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا اور باری صاحب کا اخباری دنیا میں انقلاب بپا کرنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

ایک بار پھر ''دارالاحمر'' میں لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ منٹو، احمد عباس، ابو سعید قریشی اور باری صاحب وغیرہ نے دن رات ایک کر کے لگاتار ''عالمگیر'' کا ''روسی ادب نمبر'' اور ''ہمایوں'' کا ''فرانسیسی ادب نمبر'' نکالنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ یہ منٹو کی زندگی کا بہت نازک دور تھا۔ مالی مشکلات بڑھ رہی تھیں لیکن خرچ کا وہی حال تھا۔ چنانچہ جو کچھ بھی مل جاتا غنیمت تھا۔ منٹو کی صحت الگ خراب تھی۔ سینے میں شدید درد کی شکایت تھی۔ ابو سعید کے لفظوں میں:

''وہ کبھی ٹنکچر آیوڈن ملتا اور کبھی رائی کا پلاسٹر لگائے پڑا رہتا لیکن درد نہ تھمتا۔''

درد کو دبانے کے لیے اس نے دیسی شراب پینا شروع کر دیا تھا جس کا پوا ''دارالاحمر'' کے اونچے طاقچے میں کلینڈر کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ دلّی میں بوتل لکھنے کے فرشی ڈیسک کے نیچے پڑی رہتی اور زندگی کے آخری ایام میں حامد جلال کے بیان کے مطابق وہ غسل خانے میں چھپائے رکھتا تھا۔ شاید اسے اب بھی منصف صاحب کی آنکھوں کا ڈر تھا کہ کہیں وہ تعاقب تو نہیں کر رہی ہیں؟ لیکن یہ درد کا علاج نہ تھا۔ ڈاکٹروں کو دق کا شبہ تھا۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق مریض کو اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو فوراً کسی صحت افزا مقام کا رخ کرنا چاہیے۔'' منٹو نے کشمیر کا رخ کیا لیکن ''بٹوت'' کے پڑاؤ'' پر ''بیگو'' نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ ایک نوخیز چرواہی تھی۔ ''لذت زار'' کشمیر کے سیاحوں کے لیے وہ بھی وادی کی ایک سڑک تھی اور مہاراجہ ہری سنگھ کے بزرگوں کی زرخرید املاک میں ٹول ٹیکس دے کر آنے والا ہر مسافر اسے دوسری سڑکوں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ اس کے پامال جسم میں منٹو کو ایک پاکیزہ روح نظر آئی۔ اس کے الاؤ میں اس نے محبت کی چنگاری دیکھی جسے جگانے کے لیے کسی درد مند کے

> سانسوں کی ضرورت تھی اور اسے اپنے سینے میں چھپالیا۔ لیکن زادراہ ختم ہو چکا تھا اور اسے واپس امرتسر آنا پڑا۔ اس کے سینے کا درد پہلے کی بہ نسبت بہت کم ہو چکا تھا۔[۱] ''

سماج نے اسے ملعون و مردود قرار دیا تھا۔ عزیزوں نے اپنے بچوں کو اس سے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر محبت کا معجزہ مجھ میں ظہور پزیر ہوسکتا ہے تو ان مردودوں اور ملعونوں میں کیوں رونما نہیں ہوسکتا جن کا حقہ پانی سماج نے بند کر رکھا ہے؟ ''گورکی اور دوستوسکی کی طرح وہ اس مخلوق کے سیاہ سینے میں محبت اور انسانیت کی ننھی سی شعاع تلاش کرنے کے لیے زندگی کے ''جہنم زار'' میں اتر گیا۔ اس نے کہا تھا—

''تم نہیں سمجھتے اور نہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں یہ داستانیں کیوں لکھتا ہوں، پھر بھی سمجھاؤں گا۔''

اس نے مہاتما بدھ کی طرح ویشیا کو سینے سے لگایا اور مسیح کی مانند سماج کے کوڑھیوں کے ناسور صاف کیے۔

منٹو جب پھر امتحان میں فیل ہو گیا تو علی گڑھ اس ارادے سے روانہ ہوا کہ وہاں سے پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری لے کر لوٹوں گا۔ منٹو وہاں علی گڑھ میں ۱۴ ار ایس. ایس. ایسٹ میں رہتا تھا، جہاں شاید مولانا محمد علی جوہر بھی رہتے تھے۔ اگر یہ درست ہے تو ۱۴. ایس. ایس بیت الخلا تھا اور صبح ہی لوگ بھانت بھانت کے لوٹے لیے نظر آتے تھے۔ منٹو کے لیے یہ اجتماعیت کا پہلا تجربہ تھا۔ منٹو کو اس کے بعد بھی اس تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے افسانے ''سراج'' میں کھولی کی فضا خالی خولی افسانہ نگاری نہیں، اس کے قہوہ خانے، جہاں وہ اپنے افسانوں میں بار بار قارئین کو لے جاتا ہے اسی قسم کے سنڈاس اور موتریاں ہیں۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی ایسے چہ بچے اور حواض ہیں جن کے کنارے سرسید کی روح کو ثواب پہنچانے والے وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

غرض علی گڑھ کی زندگی بالکل ہی خشک زندگی تھی۔ ''یہاں طالبات کو زنانہ کالج

---

[۱] منٹو۔ ابوسعید قریشی ص ۵۲۔

کے قلعے میں بند کر کے لڑکوں کی زندگی میں شائستگی پیدا کرنے کی تمام راہیں بند کر دی گئی تھیں۔ باہر جایئے تو ترکی کیپ پہن کر، سنیما جایئے تو پوچھ کر۔ یار لوگ ریلوے اسٹیشن حرارت حاصل کرنے جاتے اور اپنی اداسیوں میں اور بھی اضافے کر کے چلے آتے۔ جن کے پاس پیسے ہوتے وہ مہینے میں ایک آدھ بار دہلی، آگرہ ہو آتے اور دو چار دن زندگی سے خوب انتقام لے کر لوٹ آتے۔[1]''

منٹو کی صحت پھر بگڑنے لگی تھی۔ یونیورسٹی کے ڈاکٹروں نے ایکسرے کے لئے کہا جس کے لیے اسے دلی جانا پڑا۔ ایکسرے میں پھیپھڑوں پر دھبے دکھائی دیے۔ دق کا مرض تشخیص ہوا اور نتیجہ کے طور منٹو کو علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ منٹو واپس لاہور چلا آیا اور تلاش روزگار میں لگ گیا۔ اس کی صحت خراب تھی۔ گذر اوقات کے لیے منٹو نے ''کرم چند'' کے اخبار ''پارس'' میں چالیس روپے ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ وہ ان دنوں موتی ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کمرے کا کرایہ پانچ روپے تھا۔

منٹو کو جلد ہی ''پارس'' کی اصلیت معلوم ہوگئی۔ پارس کا مالک بہت کھوٹا ثابت ہوا۔ معاملہ کا گندہ اور اس سے بھی گندی اس کے اخبار کی پالیسی تھی جس کا مقصد اپنے معاصرین پر کیچڑ اچھالنا تھا۔ بات اگر حریفانہ چشمک تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن منٹو اپنے اخبار کے مالک کی ذہنی پستی تک نہیں اتر سکتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کیچڑ سے آلودہ کرنے سے انکار کر دیا جس کے عوض اسے چالیس روپے ماہانہ کا نوکر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ یہ تعلق بہت جلد ختم ہو گیا۔

> اور جب منٹو کو کوئی راہ نظر نہ آئی تو ایک بار پھر وہ بمبئی کے لیے چل پڑا۔
> ''بمبئی جہاں فلمی دنیا کو منشیوں کی ضرورت تھی اور ہفتہ وار ''مصور'' کو اڈیٹر درکار تھا۔ بمبئی جہاں پیسہ تھا، جو ایک مفلس مصنف کی جسمانی بقا اور اس کے انسانی وقار کے لیے بہت تھا۔ بمبئی جہاں آدمی ہجوم میں رہ کر بھی اپنی انفرادیت نہیں کھوتا، بمبئی جس کے گلی کوچوں میں منٹو

---

[1] منٹو۔ ابوسعید قریشی۔ ص ۹۷

> کے افسانوں کے جیتے جاگتے کردار بستے ہیں اور اسی کی طرح محبت اور وقار انسانی کی تلاش میں سرگرداں۔"[۱]

منٹو کے پاؤں کا چکر اسے بمبئی سے دلّی لے آیا تھا۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ دلّی میں آل انڈیا ریڈیو سے ڈیڑھ سو ماہانہ تنخواہ پا رہا تھا۔ کوئی سوا سال بعد جب اس نے ریڈیو کی ملازمت چھوڑ دی اور بمبئی کا رخ کیا تو اس کی تنخواہ قریب قریب دوگنی ہو چکی تھی اور کروڑوں کان ریڈیو کے ذریعے اس کے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔ "منٹو" کے نام سے وہ مشہور تھا۔

منٹو دلی میں نور حسن بلڈنگ، نکلسن روڈ میں رہتا تھا۔ تین کمروں کا یہ مختصر سا فلیٹ منٹو کی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو، جو ۱۸، انڈریل روڈ پر واقع تھا۔ وہاں بہت سے چغادری ایک ہی وقت جمع ہو گئے تھے اور ہر شخص...... "انا الحق" کا نعرہ لگا رہا تھا۔ اس میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، ن م۔ راشد، بہزاد لکھنوی، وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس دور میں منٹو نے جو کام کیا اگر اس کو نظر انداز کر کے ایک "جیب کترے" کو ہی لیا جائے تو اس کے عظمت کے قیام و بقا کے لیے بہت ہے۔

انڈریل روڈ پر حریفانہ چشمکوں کی گرم بازاری تھی۔ وہ اپنے ٹائپ رائٹر کی ٹک ٹک کے درمیان بھی "جوابی حملوں سے کبھی نہ چوکتا۔" اس کے یہاں طنز و مزاح کا ایک خاص معیار تھا۔ کسی کی ذات پر اس نے کبھی حملہ نہیں کیا۔ جو شخص بھڑووں، رنڈیوں، قاتلوں اور چوروں میں بھی انسانیت کی باقیات تلاش کر رہا تھا، اس سے بعید تھا کہ انسانوں کی توہین کرے۔[۲]"

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران منٹو نے کوئی سوا سو چھوٹے بڑے فیچر اور ڈرامے لکھے۔ جب منٹو کا ۱۰۰واں مسودہ براڈ کاسٹ ہونے لگا تو اس کی وہی کیفیت تھی جیسے کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں کسی کھلاڑی کی سنچری مکمل ہو جائے۔ وہ اپنی سنچری کو اسکور بورڈ پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا—

> "میری تصویر آل انڈیا ریڈیو کے رسالوں کے سرورق پر چھپنی چاہیے۔"

---

[۱] منٹو۔ ابوسعید قریشی۔ ص ۴۷

[۲] منٹو۔ ابوسعید قریشی۔ ص ۱۰۵۔

لیکن تصویر کو رسالے کے اندر صرف چار مربع انچ جگہ ملی اور اس تصویر کے ساتھ ایک چھوٹا سا چوکھٹا تھا۔ ''سعادت حسن منٹو جن کے سو فیچر اور ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو چکے ہیں'' اس کا دل چھوٹا ہو گیا۔ اس نے اس وقت کہا تھا——

> ''ایک ادیب کیا ان بے سرے گویوں سے گیا گذرا تھا جن کی تصویریں آئے دن ''آواز'' اور انڈین لیسن کے سرورق پر چھپا کرتی تھیں[۲]''

اس کی تصویر تو ''آواز'' کے سرورق پر نہیں چھپی تھی لیکن تنخواہ میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کی مجبور ''انا'' زخمی فصیل کے سائے میں اسے ایک اور زخم لگ چکا تھا۔ اس کا بچہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ ''آل انڈیا ریڈیو کی محکمانہ مصلحتوں نے اس بچے کو، جو فنکار کے سینے میں سو رہا تھا ایک اور کھلونے سے محروم کر دیا تھا جس سے وہ اپنا دل بہلانا چاہتا تھا۔ منصف صاحب کا کھلنڈرا لڑکا اب بھی پتنگ اڑانے کا حق رکھتا تھا لیکن اس کی دوڑ پر لنگر پھینک دیا گیا تھا۔ کوچہ وکیلاں سے بھاگ کر وہ بمبئی کے خواب دیکھنے لگا۔ سبزی منڈی دلی کے قبرستان میں اس کا بیٹا عارف دفن تھا۔ ''بمبئی کے ترقی یافتہ قبرستان'' میں عارف کی دادی سو رہی تھی۔''

اس نے بمبئی کے فلمی حلقوں سے خط و کتابت شروع کی۔ ریڈیو کی بدولت بھی اس کے نام سے متعارف ہو چکے تھے۔ جو ''ہتک''، ''خوشیا''، ''بو'' نیا قانون''، ''نعرہ'' اور ''دھواں'' کے مصنف کو نہیں جانتے تھے۔ منٹو کا نام ہی کچھ ایسا نرالا تھا کہ آدمی سن کر چونک پڑتا۔ بقول ابوسعید قریشی ''آواز'' کی دنیا میں اس کی وہی اہمیت تھی جو چارلی چیپلن کی فلمی دنیا میں۔ چیپلن کی طرح منٹو کی انفرادیت بھی اپنا نقش چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔''

بمبئی میں منٹو کو فلمستان میں ساڑھے تین سو کی نوکری ملی اور یہ نوکری شاہد لطیف کے ذریعے ملی تھی۔ منٹو بمبئی میں اپنی بیوی صفیہ کے ساتھ ''اڈلفی چیمبر میں رہتا تھا۔ فلمستان میں منٹو کی دھاک تھی۔ فلمستان کے زمانے میں منٹو سب کے مکالمے پڑھتا تھا اور سب کو رد کر کے خود لکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ سب سے اچھا ہوتا تھا۔ اسی طرح انھوں نے شاہد لطیف اور سنتوش کو فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جب کہ شاہد لطیف ہی منٹو کو فلمستان لے گیا تھا۔

---

[۲] منٹو۔ ابوسعید قریشی۔ ص ۱۱۲

ڈائریکٹر نتن بوس فلمستان میں ایک فلم بنانے آئے اور ایک نئے مکالمہ نویس کو رکھنے کی بات چلی تو منٹو نے اوپندر ناتھ اشک کا نام تجویز کیا اور اسے تار دے کر بمبئی بلوایا اور اسے فلمستان میں نوکری دلوائی۔

منٹو کی دونوں فلم "چل چل رے نوجوان" اور "شکاری" دو سال لینے کے باوجود ناکامیاب ہوئی تھی۔ "منٹو نے اشوک کمار کی فلم "آٹھ دن" کی کہانی خود لکھی۔ جب کہ وہ کہانی اوپندر ناتھ اشک لکھنے کے لیے تیار تھے۔ منٹو بعد میں فلمستان سے الگ ہوگیا۔ چونکہ اور اشوک کمار نے کمال امروہی کی کہانی "محل" پسند کی تھی۔ درحقیقت ساؤنڈ ریکارڈسٹ راجا (جو منٹو کا دوست تھا) اور بمبئی ٹاکیز کے مالک راجا میں فرق تھا اور منٹو ایسے آدمیوں میں گھر گیا جنھیں کبھی اس نے فلمستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ "اگلا راستہ بند ہے، کار موڑ نہیں چلے گی تو وہ باجو کی گلی سے پاکستان چلا گیا[1]"

منٹو کے بددل ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی کہانی —— نذیر اجمیری کی چنی گئی اور دوسری کہانی کمال امروہی کی۔ جس دن کمال امروہی کی کہانی کا پتہ چلا، منٹو نے بمبئی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر ملک کے حالات بالکل ہی ابتر ہو گئے۔ اس کے بیوی بچے اسے پاکستان بلانے لگے اور ایک دن وہ بغیر اطلاع کیے اور ملے پاکستان چلا گیا۔

—— "لیکن منٹو کی اس رن چھوڑیت اور باری صاحب کی رن چھوڑیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باری صاحب کی رن چھوڑیت میں غالباً بزدلی کا عنصر تھا۔ جب کہ منٹو کی رن چھوڑیت اس کی زبردست انانیت کے باعث تھی اور اس کی اسی انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اس میٹنگ میں جہاں راشد اور اوپندر ناتھ اشک نے اس کے ڈرامے کی "تنقید کی اور بمبئی ٹاکیز کے اسٹوڈیو میں جہاں اشوک کمار اور راجا (اس کے جگری دوستوں) نے اس کی کہانی کے مقابلے میں نذیر اجمیری اور کمال امروہی کی کہانیوں کو لے لیا، منٹو کو زبردست ٹھیس پہنچی اور جب اس کی انانیت کو ٹھیس لگی تو پھر وہاں اس کے لیے ٹھہرنا مشکل ہوگیا۔ کوئی موٹی کھال والا۔ ابن الوقت مصنف ہوتا تو جھک برداشت

---

[1] اوپندر ناتھ اشک

کرتا ہوا بھی وہیں جما رہتا، لیکن منٹو کی انانیت کے لیے وہ ہتک ناقابل برداشت تھی۔[1]’’

اوپندر ناتھ اشک کے لفظوں میں—

‘‘چونکہ پیٹ کر پیٹ دینے کے فن میں وہ ماہر نہیں تھا۔
اسی لیے دونوں بار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔’’

دونوں بار اسے سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری بار تو اس کی جان پر آ بنی لیکن تکلیف کے خوف سے اپنی انانیت کو ٹھیس لگنے نہ دینا اس نے منظور نہ کیا۔

پاکستان میں منٹو کو کشادہ، خوب صورت اور قیمتی سامان سے آراستہ بہت عمدہ مکان ملا اور شروع شروع میں منٹو وہاں بہت خوش رہا۔ پھر وہ پہلا مکان چھن گیا لیکن دوسرا مکان بھی اچھا خاصا تھا۔ منٹو کو وہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ منٹو پر مقدمہ چلا اور جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ کسی نے احتجاج بھی نہ کیا بلکہ کچھ ایسا رویہ تھا کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ اس زمانے میں منٹو کا دماغ چل گیا اور اسے پاگل خانہ بھیجنا پڑا۔ پھر منٹو ٹھیک ہو گیا لیکن بری طرح پینے لگا۔ پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا عصمت چغتائی کہتی ہیں کہ—

> ‘‘اپنے پرائے ہر ایک سے پیسہ مانگ بیٹھتے ہیں۔ اخبار والے بٹھا کر
> سامنے مضمون لکھواتے ہیں۔ پیشگی پیسہ دو تو سب کھا جاتے ہیں۔’’

چاہنے اور چاہے جانے کا مسئلہ منٹو کے افسانوں میں بار بار ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسے باپ کی محبت نصیب نہ ہوئی۔ عزیزوں نے اسے آوارہ کا لقب دیا۔ وہ پہلے امرتسر سے اور پھر بمبئی سے ‘‘شہر بدر’’ ہوا۔ فحاشی کے الزام میں اسے پانچ مرتبہ کچہریوں کا چکر لگانا پڑا۔ سیکڑوں افسانے لکھنے کے باوجود بھی مالی اطمینان اسے کبھی نصیب نہ ہوا۔ ان تمام احساسات اور ذہنی اذیت کے احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے بے تحاشا پینا شروع کر دیا جس سے اس کی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ وہ ہر جانب سے لعن طعن کا مرکز بن گیا۔ کوئی دو یا تین سال وہ سسرال کے سہارے پڑا رہا۔ ظاہر ہے کہ داماد کو اس حالت میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اسے جھنجھوڑنے کے لیے انھوں نے تلخ الفاظ بھی استعمال کیے۔ اس کی بیوی نے بھی اسے جگانے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اس کا احساس گناہ اور شدید ہو گیا

اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مدہوش رہنے لگا لیکن اسے آخری وقت تک اس بات کا ہوش تھا کہ ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

''شاید اسے محسوس ہوا ہو کہ اردو کے ان ادیبوں کی طرح جنھیں اپنے قلم سے روزی کمانا پڑتی ہے، اب میرے اپاہج ہونے کا وقت قریب آچکا ہے۔ شاید اسے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا اور شاید اگر وہ اور زندہ رہتا اور اسے روٹی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اور لکھنا پڑتا تو اس کا آرٹ زوال پذیر نظر آتا۔ لیکن یہ سب ''شاید'' کے عنوانات ہیں۔ یقینی بات اس کی ذلت کا احساس تھا۔[1]''

جب وہ بستر مرگ پر پڑا تھا اور خون تھوک رہا تھا تو صفیہ اس کی بیوی ڈاکٹر اور ایمبولنس لانے کے لیے دوڑی تو اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ''مت جاؤ صفیہ مت جاؤ! میرے پاس بیٹھ جاؤ! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ!!! اب قصہ تمام ہو چکا۔ ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا، کچھ نہیں کر سکے گا...... اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیے۔'' لیکن صفیہ ایمبولنس لانے چلی گئی اس کے جانے کے بعد وہ بار بار یہی الفاظ دہراتا رہا۔ ''اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیے...... اب یہ ذلت ختم ہو جائے گی۔[2]''

بستر مرگ پر منٹو نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ حامد جلال کے لفظوں میں۔

> ''ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔ انھوں نے آہستہ سے کہا— ''میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو۔[3]''

منٹو کو ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال لے جایا گیا۔ ایمبولنس ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر منٹو کو دیکھنے کے لیے اندر گئے تو منٹو مر چکا تھا۔ دوبارہ ہوش میں آئے بغیر ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس طرح منٹو کے حیات کا کارواں ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کی صبح میں چلتے چلتے یک

---

[1] منٹو—ابوسعید قریشی ص ۲۶۲

[2] منٹو—ابوسعید قریشی۔ ص۲۶۳—۲۶۲

[3] نقوش—منٹو نمبر ص ۳۵۱

بیک رک گیا اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن ہوا۔

منٹو نے اپنے کتبہ میں لکھا ہے۔

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔

وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا؟''

کیا ہم اسے اتنا بھی غلو کی اجازت نہیں دے سکتے۔ وہ کشمیری تھا۔ جرم وعصیاں کے آتش کدوں سے وہ ان قدیم عورتوں کی طرح جو ریل کی پٹریوں سے ایندھن اکٹھا کرتی ہیں۔ یاس وحرماں میں لپٹی ہوئی محبت کی چنگاریاں چن چن کر اپنی ''کانگڑی'' بھرتا رہا۔ سراج کی سرد مہری، بسم اللہ کی اداس آنکھوں اور شاردا کے سگرٹ کے ڈبے میں اس آگ کی چنگاریاں پوشیدہ ہیں۔ سڑک کے کنارے کے چولھے پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھیں ہیں۔ اس ان دیکھی آگ سے گرم ہیں۔ وہ اپنے پھولے ہوئے پیٹ میں یہی ''کانگڑی'' چھپائے ہوئے ہے...... وہ خود اس پالے کا شکار تھا۔[۱] ''

منٹو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار رہا ہے اور اس کے نام کے ساتھ فحش گوئی اور عریانی کچھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ بہت سے لوگ ایک دوسرے کو الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ منٹو نے اچھے اور برے دونوں طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ لوگوں نے محض اس کے بُرے افسانوں کو یاد رکھا اور جو اچھے تھے ان پر نگاہ نہ پڑ سکی۔ ترقی پسندوں نے اسے رجعت پسند کہا اور رجعت پسندوں نے سب سے بڑا ترقی پسند۔ لیکن ان سب سے بے نیاز منٹو اپنے فن کو اپنے خون جگر سے سینچتا رہا۔ منٹو نے اپنی تخلیقات کی شکل میں ہمیں سب سے زیادہ افسانوں کے مجموعے دیے ہیں۔ اس کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ، جو اس نے وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھا تھا۔ اس کے علاوہ منٹو نے مضامین بھی لکھے ہیں اور شروع میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ترجموں سے کیا۔

منٹو کی اہم تخلیقات مندرجہ ذیل ہیں—

۱۔ زہرہ (افسانوں کا مجموعہ) مکتبہ نرالی دنیا، لال کنواں، دہلی ۶

---

[۱] منٹو — ابو سعید قریشی

۲۔ سڑک کے کنارے (افسانوں کا مجموعہ) نیو تاج آفس، دہلی۔ ۱۹۵۳ء

۳۔ ٹھنڈا گوشت (افسانوں کا مجموعہ) کتب خانہ آریہ ورت، لال کنواں دہلی

۴۔ اوپر نیچے درمیان (افسانوں کا مجموعہ)

۵۔ لاؤڈ اسپیکر (افسانوں کا مجموعہ)

۶۔ پھندنے (افسانوں کا مجموعہ)

۷۔ مینا بازار (افسانوں کا مجموعہ)

۸۔ سرکنڈوں کے پیچھے (افسانوں کا مجموعہ)

۹۔ شیطان (افسانوں کا مجموعہ)

۱۰۔ دھواں (افسانوں کا مجموعہ)

۱۱۔ سیاہ حاشیے (افسانوں کا مجموعہ)

۱۲۔ منٹو کے افسانے (افسانوں کا مجموعہ)

۱۳۔ آؤ (ڈراموں کا مجموعہ)

۱۴۔ آتش پارے (ڈراموں کا مجموعہ)

۱۵۔ شکاری عورتیں (ڈراموں کا مجموعہ) منٹو کی آخری کتاب۔ مکتبۂ جدید دہلی نیا دور، لاہور

۱۶۔ لذت سنگ (مضامین کا مجموعہ)

۱۷۔ گنجے فرشتے (ڈراموں کا مجموعہ)

۱۸۔ یزید (مضامین کا مجموعہ)

۱۹۔ جنازے ظفر برادرز، بنک سکوٹر دی مال مری، لاہور۔

۲۰۔ رتی، ماشہ اور تولہ (غیر مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ) شائع کردہ۔ ظفر منزل بنک سکوٹر دی مال مری۔ لاہور

۲۱۔ غیر مطبوعہ کہانیاں

۲۲۔ سرگزشت اسیر (ترجمہ)

۲۳۔ روسی افسانہ (ترجمہ)

منٹو — پس منظر اور عہد

کسی بھی فنکار میں اس کی ادبی روایات اور ماحول کا بہت دخل ہوتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ فنکار کے فن میں اس کی ادبی روایات ماحول، زمانہ اور اس زمانے کے لوگوں کے بارے میں باتیں ہوتی ہیں۔ یعنی کسی بھی تخلیق میں ہمیں اس زمانے کا پرتو نظر آتا ہے۔ فنکار اپنے ماحول کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول کا نقاد بھی ہوتا ہے۔ اسے زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بالکل زمانہ کسی رو میں اپنے آپ کو مدغم نہیں کر دے بلکہ وہ اتنا اونچا ہو کہ زمانے کو اپنے فکر اور تصورات کے مطابق موڑ دے اور یہی ایک اچھے فنکار اور اچھے فن کی پہچان ہے۔

جہاں تک منٹو کے ادبی پس منظر کا تعلق ہے تو ہمیں پریم چند سے بات شروع کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ پریم چند اردو افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بیک وقت کئی چیزیں دیکھتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پریم چند کے افسانوں پر گردو پیش کی زندگی کے بعض اہم تقاضوں کا عکس ہے۔ سلطان حیدر جوش نے اسی ماحول میں سے ایک ایسا موضوع اختیار کیا ہے جو مسلمانوں کے ایک خاص بڑے گروہ کا نصب العین تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے اسی ماحول میں رہتے ہوئے زندگی کے ایسے گوشوں پر نظر ڈالی ہے جو غیر سیاسی ہونے کے باوجود ہر زمانے میں انسان کے لیے اہم رہے ہیں۔ ان کا موضوع عورت اور مرد کی وہ محبت ہے جو فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور قسم کے رسوم و قیود کی پابند نہیں۔ نیاز فتحپوری نے حال کی زندگی اور اس کی قید و بند سے آزاد ہو کر والہانہ عشق و محبت کی ایک دنیا آباد کی ہے۔ فن اور اس کے اہم اور غیر اہم عناصر کے معاملے میں بھی چاروں کی روش میں یکسانیت نہیں۔

مختصر یہ کہ ہمارے ان چار ابتدائی افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے مذاق اور مزاج کی

مناسبت سے کہانی سے مختلف کام لیے ہیں اور مختلف طریقوں سے لیے۔ افسانہ جب ایک صنف ادب کی حیثیت سے اردو میں پہلے پہل داخل ہوا تو وہ زندگی سے بالکل قریب بھی رہا اور اس سے بہت دور بھی۔

''وہ تلخ حقیقتوں کا ترجمان بھی بنا اور شیریں حکایتوں کا نغمہ خواں بھی۔ سیاست و مذہب، اخلاق و دین، محبت و نفرت، اہرمن و یزداں سب اس کے موضوع رہے۔ اس نے تاریخ روایت، مشاہدہ، تخیل اور تصور کی دکھائی ہوئی روشنی میں نئے نئے جہاں آباد کیے۔ وہ بیک وقت مصلح اور واعظ کا ہم زبان بھی بنا اور رندی و سرمستی کی ہم نوائی بھی کی۔ اس نے بزموں کو حسن فطرت کے رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ کیا اور ان میں عورت کے پیروں کی جھنکار بھی سنائی دی جن کے آگے ہر نغمہ خاموش اور ہر ساز محروم نوا سنائی دیتا ہے۔[1]

گویا مختصر افسانہ کا آغاز حقیقت اور شعریت، صداقت اور تصور، زندگی اور فن کے امتزاج کا ابتدائی نقش ہے۔ یہی نقش آگے چل کر زیادہ ابھرا، زیادہ چمکا اور زیادہ دلکش اور دلنشیں بنا۔

یہ ہمارے افسانے کے ابتدائی چند سال کی تصویر کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔

پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتحپوری بھی علی عباس حسینی کے علاوہ مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، احمد اکبرآبادی کی بھی جھلک دکھائی دے جاتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ وہ افسانے کی دنیا میں چھایا ہوا معلوم ہو۔ چھائے ہوئے اب وہی چار لکھنے والے ہیں۔ بلکہ حقیقت یوں ہے کہ سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم اس وقت تک اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ ان دونوں نے تقریباً ۲۰۔۲۲ سال کی مدت میں مختصر افسانہ کو بھی بعض ایسی چیزیں دیں جو اس کی روایت کا مستقل حصہ بن گئیں۔ سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت اور سلطان حیدر جوش کی اصلاح پسندی اس روایت کے دو اہم جزو ہیں اور ان کی گونج ہمارے افسانے میں آج بھی سنائی دیتی ہے۔

نیاز فتحپوری کے افسانوں میں رومانی رنگ، عورت کے ذکر اور اس کی محبت سے

---

[1] داستان سے افسانے تک ——وقار عظیم ص ۲۰۹۔۲۱۰

دین اور دنیا دونوں کو سنوار لینے کی توقع، زندگی سے قریب رہ کر بھی اس کی تلخیوں سے گریز کے ساتھ ساتھ مشاہدہ کے مقابلے میں تخیل اور تصور سے کام لینے کا رجحان نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ وہ افسانے کی زندگی کے اس دور کی یاد دلاتا ہے جب اس کے قدم تخیل، تصور اور شعریت کے گہوارے سے باہر نہیں نکلے تھے۔ رومانیت اور شعریت کی اس فضا کو چھوڑ کر زندگی کی گہما گہمی سے دوچار ہونے کی خواہش کس طرح ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے اس کا ہمیں سراغ ''ازدواج مکرر'' اور ''دو گھنٹے جہنم میں'' ملتا ہے۔ لیکن رومانیت، حسن پرستی اور اکتساب لذت کے جن رجحانات سے نیاز کی افسانہ نگاری کی ابتدا ہوئی تھی، وہ اس دور میں حقیقت پسندی کے جذبے مغلوب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

نیاز کے علاوہ اور بھی افسانہ نگار اس زمانے میں منظر عام پر آئے لیکن ان میں مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور حامد اللہ افسر ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اس عبوری دور کے گذر جانے کے بعد بھی اس صنف میں اپنے لیے جگہ بنا لی ہے۔ ان میں سے ہر افسانہ نگار کا یہ رجحان ہے کہ قدم قدم پر دو چیزیں اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہوتی ہیں۔ ایک نمایاں چیز یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار اپنے اپنے مخصوص مذاق اور ماحول کے مطابق زندگی میں انھی چیزوں کا انتخاب کرتا ہے جو افسانے کا دلچسپ موضوع بن سکتی ہیں لیکن اس انتخاب کے وقت کسی نہ کسی طرح عورت اس کے سامنے ضرور آجاتی ہے اور ایک مرتبہ جب وہ اپنی جھلک دکھا دے تو زندگی کی ہر کشش اس کے سامنے ہلکی پڑ جاتی ہے۔ مجنوں حسن و عشق کے رشتے کے معاملے میں ایک فلسفیانہ انداز فکر رکھنے کے باوجود عورت کے حسن سے مسحور اور مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اعظم کریوی ایک خاص علاقے کی دیہاتی زندگی کو اپنی کہانیوں کا پس منظر بنا کر بھی اس زندگی کے سارے رومان کو عورت کی ذات اور شخصیت سے سمٹے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ انھیں فطرت کے حسن پر بھی عورت کے حسن سحر آگیں کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ حامد اللہ افسر نے معاشرتی زندگی کے بعض بہت چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کی عکاسی کو اپنا مسلک بنایا ہے لیکن انھیں بھی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو پر عورت اپنا عکس ڈالتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ علی عباس حسینی اپنی افسانہ نگاری کے اس

ابتدائی دور میں زندگی سے بہت قریب آکر بھی محبت کے ایک والہانہ اور حد درجہ جذباتی تصور کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے جتنے افسانے لکھے ہیں ان پر کسی نہ کسی طرح عورت چھائی ہوئی ہے۔ اس دور میں وہی موضوع ہیں جن کے دم سے سجاد حیدر، سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری اور کبھی کبھی پریم چند کی دنیا آباد ہوئی ہے۔ عورت اور اس کا حسن زاہد فریب، معاشرتی زندگی میں مشرق اور مغرب کا تصادم، سیاسی انحطاط کی وجہ سے رؤسا اور امرا کے طبقے میں پھیلی ہوئی عیاشیاں، سماج میں سرایت خیر وشر کی قوتوں کا باہمی تصادم۔ ان ساری چیزوں پر علی عباس حسینی نے توجہ دی۔ اس لیے دوسرے افسانہ نگاروں سے کہیں زیادہ انھوں نے ان کے ذکر میں جذبات کی شعریت اور اسلوب کی شعریت سے کام لیا ہے۔

نیاز، مجنوں، حامد اللہ افسر، حسینی اور اعظم کریوی اور ان کے علاوہ بعض دوسرے ہم عصر افسانہ نگار مثلاً، احمد اکبر آبادی، محشر عابدی، طالب باغپتی، کوثر چاند پوری، فضل حق قریشی وغیرہ کے افسانوں میں زندگی کے ساتھ ربط اور تعلق پیدا کرنے کی خواہش موجود ہے۔ اس کا اظہار ان کے افسانوں کے عنوان اور موضوع کے انتخاب میں ہوتا ہے۔ لیکن ان سب افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ تخیل اور تصور کی دنیا کو ترک کر کے حقائق کی دنیا میں قدم رکھتے وقت بھی ان افسانہ نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں اور اس کی تلخیوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے۔ ان لوگوں میں زندگی کی گھمسان میں کود کر اس سے پوری طرح متصادم اور نبرد آزما ہونے کی جرأت کی واضح کمی ہے۔ وہ زندگی کے قریب جانا ضرور چاہتے ہیں، لیکن کوئی نامعلوم اندیشہ انھیں زندگی کے ایوان میں داخل ہونے سے روک دیتا ہے۔ انھوں نے اس کے دروازے پر دستک دینے اور زیادہ سے زیادہ تاک جھانک کر کے زندگی کا علم حاصل کرنے پر اکتفا کی ہے اور اس لیے ان لوگوں کو ایک وسیع کشادہ اور حد درجہ رنگا رنگ زندگی میں اب بھی عورت اور اس کا حسن، مرد عورت کی محبت، سماجی زندگی میں عورت کا مقام اور حق، مشرقی اور مغربی تہذیب کا تصادم اور کشمکش، امرا کی عیش پرستی اور انگریزی سامراج میں ہندوستانی افسروں کی فرعونیت جیسی چیزوں کے علاوہ انھیں اپنی کہانی کے لیے اور کوئی موضوع نظر نہیں آیا۔ ان افسانہ

نگاروں نے ان موضوعات کو جذباتی اہمیت دی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اسلوب اظہار میں کہیں کہیں غیر معمولی شعریت پیدا ہوگئی ہے اور کبھی کبھی جذباتی شدت بیان میں اعتدال اور توازن کا باعث بنی ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے کو کسی پسندیدہ انجام تک پہنچانے کے لیے ایسے اتفاقات سے مدد لینے میں بھی پوری آزادی برتی ہے جو زندگی میں بہت کم پیش آتے ہیں۔ ان افسانوں کے انجام اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے دلنشیں ہونے کے باوجود منطق سے یقیناً محروم ہیں۔ یہ ساری باتیں افسانوی روایت کا اتنا لازمی عنصر سمجھی جاتی تھیں کہ پریم چند جیسا حقیقت پسند بھی اکثر‘ بیشتر انھی کا پابند نظر آتا ہے۔ چنانچہ ''زادراہ'' کے وہ افسانے جو پریم چند نے اسی دور میں لکھے ان سب پر جذباتیت، اصلاح پسندی، مثالی تصور اور منطق کی بجائے اتفاقیت کا غلبہ ہے۔ لیکن جس طرح پریم چند کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اردو ادب میں افسانوی صنف کو روشناس کرایا اور ابتدائی دور میں اس سے ایک اہم اصلاحی مقصد کی تقلید کا کام لیا، اسی طرح انھوں نے عبوری دور میں بھی اپنے ہم عصروں کو زندگی کا صحیح مفہوم بیان کرنے کی راہ دکھائی۔ نتیجتاً پریم چند اصلاح، مثالیت اور جذباتیت کے پرستار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے بہت واضح قسم کی حقیقت نگاری کا پرچم بھی فضا میں لہرایا۔ ان کے اس زمانے کے افسانوں پر زندگی کی تلخیوں کا سایہ ہے۔ پریم چند نے زندگی کی بھول بھلیوں سے باہر نکل کر کارزار حیات میں جست لگانے کی ہمت کی ہے۔ پریم چند ہی نے پہلے پہل افسانہ نگاروں کو یہ بات بتائی کہ افسانہ انسان اور وطن کی خدمت کا ایک وسیلہ بھی بن سکتا ہے جیسے سپاہی کے لیے ہتھیار۔

فنکار کی تمنائیں، اس کا آدرش اور اعلیٰ مقصد کس طرح افسانہ نگار کی حقیقی زندگی اس کے فن کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔ یہ بات پریم چند نے بتائی۔ ان کا افسانہ ''آشیانہ برباد'' نصب العین کی عملی صورت ہے۔ پریم چند اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اپنی شان دلبری، دلربائی، مجبوری و مظلومی کے باوجود عورت آزادی کی جنگ میں ایثار و جاں بازی کا مجسمہ بھی بن سکتی ہے۔ حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اسے اب بھی مجبور و غلام کیے جانا اور اب بھی اس کے حسن عالم فریب کی ثنا خوانی میں مصروف رہنا، یہ بڑی ناانصافی کی

بات ہے۔ پریم چند نے جو بات اب تک افسانوں میں نہیں کہی تھی، انھوں نے افسانہ گوئی کی ساری مروجہ روایتوں کو ترک کر کے بڑی جرأت، دلیری اور صفائی کے ساتھ کہہ دی اور اس طرح انھوں نے یکا یک اس فن کی روایت میں ایک انقلاب کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد افسانہ نگاروں نے تخئیل اور تصور کی دنیا کو خیر باد کہا اور زندگی کے حقائق کو اپنے فن میں پیش کرنا شروع کیا۔ پریم چند کی اس انقلابی رہنمائی نے افسانہ نگاروں کی اس جھجک کو دور کیا جو اب تک طاری تھی۔ وہ زندگی کے قریب جاتے تھے لیکن ان میں زندگی سے متصادم ہونے کی ہمت نہیں اور اب بڑی تیزی سے نیاز، مجنوں گورکھ پوری، علی عباس حسینی، حامد اللہ افسر اور ان کے علاوہ بہت نئے نئے افسانہ نگاروں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا شروع کیا اور اسے بے تکلف اپنے افسانوں میں جگہ دینے لگے۔ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ افسانے میں صرف زندگی کے حقائق اور معاشرتی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر طرح کے مسائل کی ترجمانی اور عکاسی ہونی چاہیے۔ اس چیز نے افسانہ نگاروں کو اپنے لیے مشاہدے کے مخصوص میدان اور گوشے اختیار کرنے پر مائل کیا۔ ہر افسانہ نگار نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا جن سے اسے براہ راست ربط وضبط پیدا کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں یو. پی. کے خاص علاقوں کی زندگی مچلتی اور رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حسینی کے افسانوں میں اتر پردیش کے زمین داروں اور تعلق داروں کی خارجی اور داخلی زندگی کی داستانیں ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے یو. پی کے متوسط طبقہ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد کی داستان محبت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ حامد اللہ افسر کی کہانیوں میں مسلمانوں کی گھریلو زندگی کے چٹکلوں کے علاوہ زندگی کی گہرائیاں ہیں۔ نیاز فتحپوری نے اپنے افسانے کے موضوع کے لیے شہر کی مہذب اور مغرب زدہ زندگی میں سے چند ایسی باتیں چنی ہیں جو کہانی کا بہترین موضوع بن سکتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے افسانوں کو زندگی کا ترجمان اور عکاس بنانے کے علاوہ دو تین باتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کہانی کے ذریعے اپنی قوم، اپنے مخصوص معاشرہ، اپنے ملک یا ان سب سے الگ انسان اور انسانیت کی خدمت انجام دینے کے ساتھ ساتھ

وہ سننے والوں کو کوئی دلچسپ کہانی سنا سکے۔ گویا ایک طرف وہ اپنی کہانی اپنے گردوپیش کی زندگی میں ربط وضبط پیدا کرے اور دوسری طرف اس رشتے کو استوار کرنے میں فن سے مدد لے۔ سجاد حیدر یلدرم کا حسن فن یعنی رومانی افسانوں کے ذریعے زندگی اور فن کے تعلق کا احساس ایک دوسرے انداز میں عام ہو رہا تھا۔ لکھنے والے اب رومانیت اور فن کی بجائے زندگی اور فن میں مطابقت پیدا کرنے کی لذتوں سے آشنا ہو رہے ہیں اور فن کے رشتے کا جو احساس پہلے بڑا ہلکا اور غیر محسوس تھا، وہ اب اچھی طرح سے واضح ہو رہا ہے۔

اب کئی چیزیں ایسی ہیں جو بے حد واضح اور نمایاں طور پر اردو کی افسانوی دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ اس دور نے اردو ادب کو کئی لکھنے والے دیے۔ ان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کی تخلیقات ہم عصر افسانہ نگاروں کی تقلید اور پیروی کا نتیجہ ہیں لیکن ایسے لکھنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں، جنھوں نے زندگی کا صحیح مشاہدہ کیا اور ایسی چیزیں دیں جو کشش کا سبب بن سکیں۔ ایسے لکھنے والے ایک مخصوص حلقے تک رسائی حاصل کر سکیں۔ ان میں زیادہ تر لوگوں نے تھوڑے دنوں بعد لکھنا بند کر دیا۔ اس لیے ان کی آواز دور تک نہیں پہنچ سکی۔ اب افسانہ کا عام رجحان واقعہ نگاری پر ہو گیا۔ اب وہ صرف قارئین کی خوشنودی کے لیے نہیں لکھتے تھے بلکہ ان لوگوں کی کوشش عموماً یہ ہوتی تھی کہ وہ افسانے کا عنوان ہی ایسا رکھیں جسے دیکھنے سے یہ ظاہر ہو کہ افسانہ میں محض تخیل، تصور اور شاعرانہ ترنگ نہیں، بلکہ زندگی کا ایک حقیقی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس زمانے کے افسانہ نگاروں نے زندگی اور فن کو ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانے کے افسانے بین الاقوامی، سیاسی اور معاشی حالات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۹ء کے عالم گیر معاشی بحران نے مشرق ومغرب دونوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا پرتو ملکی قومی زندگی کے انتشار واضطراب کے ترجمان ہیں۔ اس زمانے کے افسانوں میں سیاسی باتیں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ زندگی کے ریشے ریشے میں داخل ہو چکی تھیں۔ سیاسی حالات کا یہ عکس حقیقت نگاری کے رجحان کو مستحکم بناتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ہر افسانہ میں قدم قدم پر زندگی کی جھنکار سنائی دیتی ہے۔ اب افسانہ کے دامن میں

صرف مسرت و شادمانی کے پھول میں نہیں بلکہ آنسوؤں کے موتیوں کی بھی کثرت ہے۔ زندگی کی چمک اور مہک سے افسانے کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔ زندگی اب آہستہ آہستہ افسانے پر پوری طرح قابض ہو چکی ہے۔

یہ حال تو زندگی کا ہے۔ زندگی اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ افسانوی دنیا میں داخل ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں فن کی اہمیت پر بھی لوگوں نے روشنی ڈالی۔ اس زمانے میں ہمارے نقادوں نے اس کی ضرورت محسوس کی اور انھوں نے فن کی اہمیت پر مقالے لکھ کر افسانہ نگاروں کی راہ میں دیے جلائے۔ افسانہ فنی حیثیت سے چونکہ مغرب کی چیز ہے اس لیے نقادوں کی اس روش نے لکھنے والوں کو نئی راہیں دکھائیں اور پڑھنے والوں کی بھی رہنمائی ہوئی۔ لیکن فن کے نقطۂ نظر سے ہمارے افسانہ نگاروں اور قارئین کو اور مجموعی حیثیت سے خود افسانے کی صنف کو جو فائدہ اس زمانے کے افسانے کے ترجموں سے ہوا خصوصاً دوسری زبانوں کے افسانوں کے ترجموں نے ایک نئی سمت عطا کی۔

یوں تو دوسری زبانوں سے ترجموں کا سلسلہ افسانہ نگاری میں بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور ہمارے افسانہ نگار اکا دکا افسانوں کا ترجمہ اردو میں پیش کرتے رہے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد اس روش میں اتنی تیزی آگئی کہ اس نے ایک مہم کی صورت اختیار کر لی۔ بقول وقار عظیم——

> ''افسانہ نگاروں کے مجموعوں اور رسالوں کی ورق گردانی کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مغرب و مشرق کی شاید ہی کوئی زبان ہو جس کے ترجمے اس دور میں اردو میں نہ ہوئے ہوں۔ انگریزی کے علاوہ جرمنی، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، ولنیزی، ہنگری، بلجیمی، سلفی پوش، امریکی، روسی، ترکی، عربی، چینی، جاپانی مختصر یہ کہ تقریباً ساری مشہور زبانوں کے افسانے اس دور میں اردو میں منتقل ہوئے[1]''

ترجمہ کرنے والے افسانہ نگاروں میں معروف و غیر معروف دونوں ہی قسم کے

---

[1] داستان سے افسانے تک —— وقار عظیم ص ۲۲۲۔

لکھنے والوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، محشر عابدی، فضل حق قریشی، سعادت حسن منٹو، ظفر قریشی، جلیل قدوائی، اختر حسین رائے پوری، محمد مجیب، حامد علی خان، منصور احمد، خواجہ منظور، زبیر احمد تمنائی کے نام نمایاں ہیں۔ ان میں سے بعض افسانوں کے ترجمے موضوع اور فن کے لحاظ سے اب بھی اتنے اہم ہیں جتنے اس وقت تھے۔

ترجمہ کرنے والوں میں خواجہ منظور، محمد مجیب، منظور احمد اور جلیل قدوائی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان خاص مترجم افسانوں کو پڑھنے سے قاری یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کسی دوسری زبان کا ترجمہ کیا ہوا افسانہ پڑھ رہا ہے بلکہ وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنی ہی زبان کا کوئی طبع زاد افسانہ پڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اچھے ترجمہ کرنے والوں نے ترجمہ کرتے وقت کئی باتوں کا خیال رکھا۔ انھوں نے ترجمے کے لیے ایسے ہی افسانوں کا انتخاب کیا جو اپنے فنی مزاج میں اردو داں طبقے کے فن مذاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں اور فن کی ایسی نزاکتیں اور لطافتیں ہیں کہ جو پڑھنے والے کو گرویدہ و مسحور کر لیتی ہیں۔ پڑھنے والے اس میں اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنے ماحول اور تجربہ کا قصہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس لیے اس دور کے بعض ترجمے پورے دور کے طبع زاد افسانوں نے ہمارے افسانوی فن کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ہمارے فن کی روایت پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح چیخوف کی بھی احسان مند ہے اور اسی لیے وہ ترجموں کے اس عہد کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

زندگی کی حقیقتوں کو افسانہ کا موضوع بنانے کی روش اتنی عام ہوئی کہ اب کوئی افسانہ نگار زندگی کے حقائق سے الگ افسانہ کا تصور ناممکن سمجھتا ہے۔ افسانہ اور زندگی دونوں پوری طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور اب ہر افسانہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کو اپنے افسانوں میں اجاگر کرتا ہے۔ اس لیے ایک افسانہ نگار اور دوسرے افسانہ نگار میں فرق پیدا ہوا اور افسانہ کی دنیا میں تنوع، رنگا رنگی اور بوقلمونی پیدا ہوئی۔ ایسے افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری اور سجاد ظہیر قابل ذکر ہیں۔ اختر حسین رائے پوری نے

ترجمے بھی کیے اور طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ اختر انصاری نے ''نازو''، ''آہ! میرے بچوں کی قسمت''، حیات اللہ انصاری نے ''بڈھا سود خوار'' اور ''بے وقوف''، اختر حسین رائے پوری نے ''زبان بے زبانی'' اور ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' سجاد ظہیر نے ''دلاری'' اسی زمانے میں لکھے۔ احمد علی کا مشہور افسانہ ''مہاوٹوں کی ایک رات'' اور فیاض محمود کا افسانہ ''زبیدہ'' بھی اسی زمانے کی تخلیقات ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دور اچھی تخلیقات کا بھی دور ہے۔ ہمارے مترجمین نے بھی ایسی تخلیقات پیش کیں جن کی ادبی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

زندگی اور فن میں جب ہم آہنگی پیدا ہو جائے اور فنکار دونوں کی اہمیت کو یکساں تسلیم کرنے لگے تو فنی تخلیق کتنی دلنشیں بن جاتی ہے اس کا اندازہ اسی زمانے کے بعض افسانوں کے مطالعے سے کیا جا سکتا ہے۔ اب موضوع میں حقیقت پسندی اور فن میں اصول و ضوابط کی پابندی ایک دوسرے میں دکھائی دیتی ہے۔ پریم چند اس زمانے میں بھی موضوع اور فن کے امتزاج کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی اور شان برقرار رہتی ہے۔ ان کا افسانہ ''کفن'' افسانوی فن کی روایت میں ایک اہم منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں زندگی اور فن کا جو صحیح امتزاج ہے اس سے بعد کے افسانے کو اپنا فنی رخ بدلنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے [1]''

پریم چند کا افسانہ ''کفن'' اردو افسانوی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ''کفن'' کے علاوہ بعض چیزیں اور بھی ہیں جن کی روشنی میں افسانے کی نئی نئی شاہراہیں نظر آئیں۔ ان بعض چیزیں میں سے ایک ۱۹۳۵ء میں شائع ہونے والا دس افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''انگارے'' ہے، اور دوسرے ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام'' ۔[2]

''انگارے'' میں مغرب کا فن اور مشرقی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے واقعات کا بیان ہے۔ اس میں ہندوستان کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی اور اس کی پیدا شدہ عجیب و غریب شخصیتوں اور ذہنیتوں کی تیکھی تصویریں ہیں۔ یہاں ہر جگہ تلخ طنز اور بے باکی خیال

---

[1] ۔ ۔ستان سے افسانے تک وقار عظیم ص ۲۲۶

[2] ۔ ۔تان سے افسانے تک وقار عظیم ص ۲۲۹

ہے۔ اس میں کہیں کہیں تمسخر اور جھنجلاہٹ کی کیفیت نمایاں ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس سے قبل اردو افسانوں میں اتنی وسعت، صاف گوئی اور بے باکی نہیں ملتی۔ ''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے زندگی کے ان پہلوؤں کو طشت از بام کیا ہے، جن کی طرف سے لوگ اب تک چشم پوشی برتتے آئے تھے۔ یہاں پردہ داری کی بجائے پردہ کشائی ملتی ہے۔ اس لیے قاری کو دھچکوں کا احساس ہوتا ہے۔ ان افسانوں میں موضوع اور فن دونوں لحاظ سے ایک باغیانہ قدم اٹھایا گیا ہے۔

''انگارے'' میں کل دس کہانیاں ہیں۔ پانچ سجاد ظہیر کی دو رشید جہاں کی، دو احمد علی کی ایک محمود الظفر کی۔ سجاد ظہیر اور احمد علی کی کہانیاں مغرب کے افسانوں کے اس فن کی مثالیں ہیں جو لارنس اور جیمس جوائس کے اثر سے اردو میں داخل ہوئیں۔ ان افسانوں میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ پھر بھی اتنی باتیں کہی جاتی ہیں جو پلاٹ اور کردار کی کہانیوں میں کہنی ممکن نہیں۔ متعدد تصویریں ایک دوسرے میں گھل مل کر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش مرتسم ہو جاتی ہیں۔ کسی منظر کو دیکھ کر افسانہ نگار کے ذہن میں کسی واقعہ کی تصویر در آتی ہے۔ اس تصویر کے ساتھ ہی ایک دوسری تصویر ابھرتی ہے۔ ایک خیال کے ساتھ دوسرا خیال۔ خیالات کا یہ سلسلہ بنا رہتا ہے کہ یکا یک کوئی آواز، کتے کی بھوں بھوں یا گھنٹے کی ٹن ٹن، سنیما کی طرح منظر بدل کر دوسرا منظر لے آتا ہے۔ وہی خیالات کا تانا بانا، ہر خیال کے ساتھ اپنی رائے، تنقید، طنز اور کبھی کبھی یہ چیز غصہ، گالی گلوج، جھنجلاہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے افسانوں میں بیسیوں باتیں کہی جاتی ہیں۔

''انگارے'' اور ''کفن'' میں فرق ہے۔ ''کفن'' نے اردو افسانے کو ایک سنجیدہ، دھیمی، سبک رو، لیکن دیرپا بغاوت کی راہ دکھائی لیکن ''انگارے'' نے جارحانہ انداز فکر ونظر کو انقلاب کا پیش خیمہ بنا کر پیش کیا۔ ''کفن'' میں گہرائی ہے اور اس میں انسانی فطرت کی پوشیدہ تہوں تک پہنچنے کی صلاحیت ہے۔ ''انگارے'' کی نظر زندگی کے خارجی پہلو پر زیادہ ہے اور عمل جراحی کرنے پر وہ اصرار کرتی ہے۔ فن کی قدر دونوں جگہ ہے۔ دونوں فن کے پرستار ہیں۔ لیکن ''کفن'' میں پریم چند نے فن کے ماضی کو سامنے رکھ کر اسے زیادہ حسین اور زیادہ بامعنی

بنانے کی کوشش کی ہے۔ ''انگارے'' میں ترقی پسندوں نے ماضی کی روایات کو ٹھکرا کر فن کو ایک نیا رخ، ایک نیا آہنگ عطا کیا ہے اور آزادانہ مسلک کی پیروی کی ہے اور اب اردو افسانہ دونوں چیزوں کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ نتیجتاً اردو افسانہ نئی سمت کی جانب گامزن ہے۔

موضوع اور فن کے نقطۂ نظر سے ''کفن'' اور ''انگارے'' میں جو باتیں بنیادی طور پر موجود تھیں۔ ترقی پسند تحریک نے جس کی بنیاد ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں پڑ چکی تھی اس تحریک کے ذریعہ ان باتوں کو زیادہ عام ہونے کا زیادہ پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا۔ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت پریم چند نے کی اور اس کا لائحہ عمل اور نصب العین ''انگارے'' کے مصنفین نے مرتب کیا۔ اس طرح فن کا وہ سارا روایتی سرمایہ جسے پریم چند نے مالا مال کیا تھا اور فنی نقطۂ نظر کا وہ سارا انقلابی اور جارحانہ رنگ جس کی پیش کش انگارے میں ہو چکی تھی۔ ایک باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی شکل میں ہندوستان کی ادبی زندگی میں سرایت کرنے لگا اور بہت جلد ایسے افسانہ نگار جو اس تحریک سے علاحدہ تھے، موضوع اور فن کے اعتبار سے اسی روش پر چلنے لگے جو ترقی پسند تحریک نے جاری اور قائم کی تھی۔

پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے پہلے جلسہ میں اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے کہا تھا—

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا نہ اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، جس کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔[1]''

اسی طرح انجمن کے اعلان نامہ میں ایک جگہ کہا گیا تھا:

> ''ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن

---

[1] روشنائی — سید سجاد ظہیر ص ۱۲۳

کے ہر شعبہ میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس لیے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں۔[1]''

وقار عظیم کے خیال کے مطابق ——

—''۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے وسط تک کا افسانہ پریم چند اور ترقی پسندی کے بانیوں کی کہی ہوئی پر لبیک کہتا سنائی دیتا ہے۔[2]''

یہ افسانے، پریم چند کا خطبہ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقاصد کی صدائے بازگشت ہیں اور اسی لیے موضوع اور فن کے اعتبار سے افسانے نے اس دس برس کی مدت میں اتنی ترقی کی کہ وہ کبھی کبھی مغرب کے اچھے سے اچھے افسانوں کا ہم پلہ نظر آتا ہے۔

علی عباس حسینی کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، ان کے علاوہ بلونت سنگھ، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں اور ابراہیم جلیس وغیرہ نے افسانے میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ اب فن کے ساتھ پورا خلوص برتا جانے لگا اور اسے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ ماحول اور شخصیت کے عناصر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کرنے لگے۔ وہ لوگ افسانہ لکھنے سے پہلے اسے اپنی شخصیت کے جذباتی، فکری اور تخیلی تجربات کو ان عناصر میں پوری طرح رچا کر کوئی قدم اٹھاتے تھے۔ وہ اسی موضوع اور ماحول کو پیش کرتے تھے جس سے ان کی پوری واقفیت ہوتی تھی۔ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اپنے ذہن کو اسی ماحول سے ہم آہنگ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ کسی فرد کی ذہنی اور جذباتی دنیا میں اور کسی حد تک فکری دنیا میں جو تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کی طرف سے یہ افسانہ نگار غافل نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تیزی سے بدلتے ہوئے خارجی ماحول اور اس سے متاثر اور بدلتی ہوئی شخصیت کے ساتھ ان کا فن بھی بدلتا اور ترقی کی منزلیں طے کرتا تھا۔ کرشن چندر راجندر سنگھ بیدی، اختر انصاری، احمد علی،

---

[1] داستان سے افسانے تک —— سید سجاد ظہیر ص ۱۳۳

[2] داستان سے افسانے تک —— سید سجاد ظہیر ص ۲۳۲

احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، وغیرہ کے افسانوں میں ماحول، شخصیت کے ساتھ ہم آہنگی اور فنی ارتقا کی نمایاں مثالیں ہم دیکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر افسانہ نگار کے فن نے مختلف مدارج اور مراحل طے کر کے جو نمایاں بلند مقام حاصل کیا ہے، وہ فنی خلوص، انہماک اور سنجیدگی کے شاہد ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں نے فن کے ساتھ پورا اخلاص برتا ہے اور زندگی کے ساتھ بڑا والہانہ رشتہ جوڑا ہے۔ یہ زندگی کی تبدیلی کے ساتھ افسانے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی کوشش انھیں فن کے نئے نئے تجربوں کی طرف مائل کرتی ہے۔

یہ افسانہ نگار موضوع کے سلسلے میں پورا خلوص برتتے ہیں۔ یہ صرف اس ماحول اور ان کرداروں کے متعلق کچھ کہتے ہیں جن سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان افسانہ نگاروں میں ہمیں مختلف ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ کچھ افسانہ نگاروں کے افسانوں میں دیہاتی زندگی، ہنستی کھیلتی، تڑپتی اور تلملاتی نظر آتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی سہیل عظیم آبادی، حیات اللہ انصاری اور دیوندر ستیارتھی کے افسانوں میں پنجاب، بہار، یوپی اور ہندوستان میں بکھرے ہوئے بے شمار دیہاتوں کے مسائل پیش ہوئے ہیں۔ دیہات ایک ہونے کے باوجود کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کی رنگارنگ زندگی میں کتنی وسعت ہے۔ یہ عناصر ان مختلف افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔

شہری زندگی دیہات سے بالکل مختلف ہے۔ بمبئی، دہلی، لاہور، اور لکھنؤ شہر ہیں۔ پھر بھی ان کا اپنا الگ الگ مخصوص رنگ ہے اور ہر ایک کا رنگ دوسرے سے اتنا جدا کہ سب رنگ ملا کر ایک حسین گلدستہ بنتا ہے۔ پھر ان سب سے الگ کشمیر جنت نظیر ہے۔ ان سب شہروں کی سیر ہمیں سعادت حسن منٹو، احمد علی، حیات اللہ انصاری اور کرشن چندر نے کرائی ہے۔ شہروں میں زندگی کی مختلف سطحیں اور طبقے ہیں۔ ہر طرح کے لوگ، ہندو گھرانے، مسلمان خاندان، عورتیں، مرد، بچے بوڑھے، یہ سب ہم حیات اللہ انصاری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ کے افسانوں میں پاتے ہیں۔

یہ سب لکھنے والے ایک خاص ماحول کو اپنے لیے مخصوص کرنے کے بعد اس پوری طرح مشاہدہ کرتے ہیں اور اس مشاہدہ کو مطالعہ تخیل اور فکر کی پوری آنچ دیے بغیر افسانہ کا موضوع نہیں بناتے۔ زندگی سے گہرے لگاؤ کا ایک پہلو تو یہ ہے اور دوسرا یہ کہ ماحول کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان افسانہ نگاروں کو موجودہ دور میں زندگی کی پیچیدگیوں کا پورا احساس ہے۔ اس لیے وہ اس مخصوص ماحول کے واقعات اور اس کے کرداروں کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اس کے پس منظر میں ایک وسیع تر زندگی لہریں لیتی دکھائی دیتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گھریلو زندگی اور ہمارے دیہاتوں اور شہروں پر نہ صرف ملکی سیاست کا گہرا اثر ہے بلکہ بین الاقوامی دنیا میں سیاست کے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اور جن کے باعث معاشی کشمکش اور الجھنیں پیدا ہوئیں ان سب کا رشتہ کسی نہ کسی طرح ان محدود مسائل سے ملتا ہے جو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے لیے منتخب کیے ہیں۔ کرشن چندر کی رومانی فضا میں حسن فطرت اور عورت کی رومانی کشش کے علاوہ کسان، لگان، نمبردار، رشوت، بیوی بچوں کی ذمے داری، پکی فصل، مزدوروں کی تلاش اور اس کے لیے دربدر کی ٹھوکریں اور پھر مزدور، سیٹھ، طوائف، فلسفی، کلرک، ملازم، جنگ، مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ، بنگال کا قحط، چین کی آزادی، سامراج، فاشیت اور بین الاقوامی دنیا میں معاشی کشمکش جیسے موضوع بکھرے ہوئے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں پنجاب کے دیہات کے مخصوص رومانی مناظر اور اس کی زندگی کی روح، چوپال کے علاوہ خلافت، ریڈیو، فوجی بھرتی، اور انقلاب زندہ باد جیسی چیزوں کا گہرا عکس ہے۔ یہی صورت تقریباً سبھی افسانہ نگاروں کی ہے۔

اس دور کی افسانہ نگاری کا ایک واضح میلان یہ ہے کہ لکھنے والے واقعات پر پوری توجہ صرف کرنے کے باوجود ان واقعات میں الجھے ہوئے کرداروں کو اپنے مشاہدہ، مطالعہ اور تجزیہ کا قریبی محور اور مرکز سمجھتے ہیں۔ مثلاً بیدی کے افسانے ”کوارنٹین“ اور ”زین العابدین“ کو پڑھ کر قاری کا دل جہاں ایک طرف واقعات کی گہری واقعیت کا اثر قبول کرتا ہے۔ دوسری طرف ان کہانیوں کی فضا میں چلنے پھرنے والے ”بھاگو“ اور ”زین العابدین“ کو بھی ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ یہی خصوصیت ہم دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں پاتے ہیں۔

عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، کے بہت سے افسانوں میں کرداروں کی کشش، واقعات کی دلنشینی سے کہیں زیادہ نمایاں ہے۔

ان افسانہ نگاروں کے یہاں واقعات کی اہمیت کے ساتھ کرداروں کی شخصیت کی انفرادی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں سیاست، معشیت اور سماجی قیود کی چیرہ دستیوں کو زیادہ دخل ہے۔ ان چیرہ دستیوں میں سامراج اور سرمایہ داری کے پیدا کیے ہوئے ''بھوک'' کے مسئلے کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے زندگی کے معاشی پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں بہت اہم جگہ دی ہے۔ مظلوم کی حمایت اور پاس داری کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ مزدور اور کسان کے علاوہ کلرک، طوائف، عورت اور بچے بھی مظلوم ہیں۔ ظالموں کی صف میں سامراجی حاکموں اور ساہوکاروں کے علاوہ ان کے ساتھ سازش کرنے والے مذہبی رہنما اور اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے والے سیاسی لیڈر بھی شامل ہیں۔

زندگی میں معاشی اور نفسیاتی پہلوؤں کو یہ مرکزی حیثیت دینے کی بنیاد جہاں ایک طرف افسانہ نگاروں کا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے، دوسری طرف مارکس اور فرائڈ کے نظریات کا مطالعہ بھی اس کا ذمے دار ہے۔ مارکس کے معاشی اور فرائڈ کے جنسی خیالات، تصورات مغربی افسانوں اور ناولوں کے راستے سے ہمارے افسانہ نگار تک پہنچے ہیں اور انھوں نے ان کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اس طرح اس دور کی افسانہ نگاری بعض حیثیتوں سے مارکسی اور فرائڈی تصورات کے رنگ میں رچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی اسی دور کے افسانے ایک ایسے مقام پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں جو انھوں نے اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں کیا تھا نہ صرف یہ بلکہ آنے والے زمانے میں بھی ہمیں فن کی وہ ہمہ گیری اور ہمہ رنگی کہیں دکھائی نہیں دیتی جو اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔

بیان میں نئے نئے تجربے کرنے کے علاوہ ان لکھنے والوں نے فن کے نئے اسلوب اور نئے اسلوب کی نزاکتوں کو پوری آزادی سے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ موضوع کی جدت، ندرت، وسعت اور گہرائی نے فن کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ ان نئی راہوں

میں سے کچھ تو مغرب کی تقلید کے اثر سے آئی ہیں اور کچھ لکھنے والوں کی ذہانت اور جدّتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ بعض انداز ایسے ہیں جہاں مغرب کی جدّت اور مشرق کی روایت کی آمیزش اور امتزاج ہے۔ مثال کے طور پر حسن عسکری کے افسانے خالص مشرقی زندگی اور مغرب کے افسانوی فن کے امتزاج کا نمونہ ہیں۔ احمد علی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور بیدی کی افسانہ نگاری جدّت اور روایت کی حسین آمیزش کی تخلیق ہیں۔ احمد علی کا ''ہماری گلی'' اور ''میرا کمرہ''۔ کرشن چندر کا ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' راجندر سنگھ بیدی کا ''گرم کوٹ'' اور عصمت چغتائی کا ''دوزخی'' اور حیات اللہ انصاری کا ''آخری کوشش'' میں موضوع اور فن دونوں کے بہترین عناصر یکجا ہیں اس لیے ان میں سے ہر افسانہ کی حیثیت افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی ہے۔

کرشن چندر، بیدی، عصمت، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری اور اختر اورینوی وغیرہ کے افسانے مشاہدہ، مطالعہ فکر تخیل، تصور اور فن کا بہترین امتزاج ہیں۔ ان میں مجموعی حیثیت سے زندگی کا شعور، فن کا احساس اور شخصیت کا پرتو اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا اور ایک کے بغیر دوسرے کا تصور محال ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے افسانوی فن کی روایت کو وسعت، گہرائی اور تنوع دیا اور مستقبل کے لیے ایک گراں قدر سرمایہ چھوڑا جسے دیکھ کر مسرت و فخر سے سر اونچا ہوتا ہے، لیکن اسی زمانے میں بعض ایسے لکھنے والے بھی پیدا ہوئے اور اچھے لکھنے والوں نے بعض افسانے ایسے بھی لکھے جن میں گمراہی کے پہلو موجود ہیں۔ تاہم اپنے لیے صرف اسی ماحول کو مخصوص کیا ہے، جس کے متعلق ان کا مشاہدہ اور علم براہ راست یقینی ہے۔ ماحول کے انتخاب کے بعد ان لوگوں نے افسانوں کے موضوع چنتے وقت برابر صحیح فنی نظر انتخاب سے کام لینا ضروری سمجھا ہے۔ اس لئے غلام عباس، حسن عسکری، بلونت سنگھ وغیرہ نے ایسے افسانوں کا اضافہ کیا ہے جو افسانے کی روایت کے ساتھ باقی رہیں گے۔

افسانہ فن کی اس بلند منزل پر پہنچا تھا کہ قیامِ پاکستان نے زندگی کی ہر دوسری چیز کی طرح اس میں بھی انتشار پیدا کر دیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد جو غیر معمولی حادثات رونما

ہوئے، انھوں نے زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم کردیا۔ اس سے لازمی طور پر ادیبوں اور فنکاروں کے کام میں بھی درہمی پیدا ہوئی اور تھوڑے دنوں تک یوں محسوس ہوا کہ جیسے زندگی میں ہمواری اور استواری آئے گی اور ادب اور ادیب اپنا منصب پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوسکیں گے لیکن انتشار اور اضطراب زندگی کے عارضی پہلو ہیں۔ انتشار اور اضطراب آہستہ آہستہ کم ہوا اور ادیبوں نے آہستہ آہستہ سوچنا اور لکھنا شروع کیا اور اس عارضی تعطل کے بعد ادب کی جس صنف نے زندگی کا سب سے زیادہ اور اہم ثبوت دیا وہ افسانہ تھا۔

تقسیم کے بعد علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، احمد علی، اختر انصاری اور حسن عسکری نے لکھنا بند کردیا۔ اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری نے بہت کم لکھا۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے کافی لکھا۔ اشک نے جو کچھ لکھا اس میں ان کا ماحول وہی ہندو معاشرہ جسے عموماً انھوں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ فن میں کوئی انقلاب پیدا کرنے کی خواہش نہ ان میں کبھی تھی نہ ان غیر معمولی حالات میں ظاہر ہوئی۔ بیدی نے تقسیم کے حوادث کو پس منظر بنا کر ایک افسانہ ''لاجونتی'' لکھا۔ یہ افسانہ فنی بلندیوں اور نزاکتوں کے نقطۂ نظر سے ''دانہ و دام'' اور ''گرہن'' جیسے اچھے افسانوں کا ہم پلہ نہیں لیکن بیدی کے نفسیاتی طرز کا عکس اس میں بھی موجود ہے۔ حیات اللہ انصاری کے تین چار افسانوں میں ''ماں بیٹا'' اور ''شکر گذار آنکھیں'' پر تقسیم اور اس کے فوراً بعد کے غیر معمولی واقعات کا عکس اور ردِ عمل نمایاں ہے۔ لیکن تقسیم کے افسانوں میں جذباتی شدت کی جو گراں باری ہوتی ہے اس کے بجائے یہاں خاصا فنی اہتمام اور احتیاط ہے اور یہ خصوصیت حیات اللہ انصاری کے فن کی امتیازی خصوصیت ہے۔ لیکن حیات اللہ انصاری کے اس دور کے دو ایک افسانے ایسے ہیں جن میں فنی شعبدہ گری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عصمت نے اس زمانے میں جو کچھ لکھا ہے وہ واضح طور پر ان کے فنی انحطاط کا مظہر ہے۔ ''کینڈل کورٹ'' اور ''جڑیں'' جن کا موضوع تقسیم اور اس کے بعض اہم نتائج ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں فنی اہتمام کی کمی تو نہیں لیکن ایک خاص طرح کی مقصدیت فن پر غالب ہے اور افسانہ نگار کی شخصیت کہیں نہیں ابھرتی۔ جو افسانے تقسیم سے متعلق نہیں ہیں۔

ان پر کہیں کہیں ایک سستے قسم کی جذباتی سیاسی فضا طاری رہتی ہے اور فن کی وہ روک تھام، ٹھہراؤ اور رکھ رکھاؤ نہیں جو کبھی عصمت کے فن کا حسن تھا۔ ''سونے کا انڈا'' اور ''چوتھی کا جوڑا'' البتہ ''چوٹیں'' اور کلیاں والے دور کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

تقسیم کے بعد کرشن چندر اور منٹو نے دوسروں سے بہت زیادہ لکھا۔ کرشن چندر کے افسانوں کے کئی مجموعے ''ہم وحشی ہیں''، کے بعد ''تین غنڈے'' اور ''ہم وحشی ہیں'' کے سارے افسانے فسادات کے موضوع ہیں اور انھیں بدی کے خلاف نیکی کا ایک نہ ٹوٹنے والا مضبوط محاذ کہنا مناسب ہے۔ فسادات کے موضوع پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں۔ ان میں اکثر فنی حیثیت سے بے اثر ہیں لیکن کرشن چندر نے اس عارضی اور ہنگامی موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس میں فن کی اہمیت اور معنویت کو بہت حد تک فراموش اور نظر انداز کیا ہے۔ ان افسانوں کا دور ختم ہونے کے بعد کرشن چندر نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہر جگہ فن کا کوئی نہ کوئی نیا انداز ہے اور اردو کا نیا قاعدہ، ایک نافسطائی کی ڈائری، بادشاہ اور ناپختہ میں یہ نیا پن نمایاں ہے۔

منٹو نے کرشن چندر سے بھی زیادہ لکھا اور تقسیم کے بعد ان کے لکھے ہوئے سو سے بھی زیادہ افسانے دس گیارہ مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب افسانوں پر منٹو کا ماحول، شخصیت اور ان کے فن کی مختلف خصوصیات نمایاں ہیں۔ ان افسانوں میں اکثر مقامات پر تخیل اور تصور کی ندرت، تازگی اور رنگینی ہے لیکن ایک ایسے انداز میں جو سننے والے کو تامل اور شبہہ میں مبتلا کر دیتی ہے، ''ساڑھے تین آ۔ ''،''صاحب کرامات''، ''بادشاہت کا خاتمہ'' اور ''عشق حقیقی'' میں کہیں جنس اور اس کے شدید احساس نے فن کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن بعض افسانے یقیناً ایسے بھی ہیں جن میں مشاہدے کی باریکی، غور و فکر کی گہرائی فن کی تاثیر بے حد نمایاں ہے۔ ان کے مجموعے ''یزید'' کے اکثر افسانوں میں فن اور شخصیت کے رچاؤ کی بڑی دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ اسی طرح ''موذیل'' سوچی سمجھی اور رچی ہوئی کردار نگاری کا بڑا کامیاب نمونہ ہے۔ ''موذیل'' کے علاوہ ''سہائے اور رام کھلاون'' کے کردار بھی ایسے ہیں جن کی یاد کا نقش کبھی محو نہیں ہو سکتا۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں فن کے ٹھہراؤ اور استدلال کا مظاہرہ نمایاں ہے۔ ''آس

پاس''، ''درو دیوار'' اور ''سناٹا'' (افسانوں کے مجموعے) مجموعی حیثیت سے ماحول کی بدلتی ہوئی کیفیت کے صحیح مصور اور ترجمان ہیں اور مصنف کے ذہنی اور جذباتی رجحانات کا گہرا نقش بھی۔ ان افسانوں میں مشاہدہ، احساس اور فکر کی مکمل ہم آہنگی ہے۔ ندیم کے ان افسانوں کے ذریعے اپنے جانے پہچانے ماحول میں رہ کر انسانیت کی بلند قدروں کی ترجمانی اور تبلیغ کی جو خدمت انجام دی ہے اس میں ان کا نقطۂ نظر اور مسلک سیاسی سے زیادہ تہذیبی اور فنی ہے۔ ''نیا فرہاد''، ''تسکین''، ''جب بادل امڈے'' اسی انداز کی عکاسی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر ''الحمد اللہ''، ''رئیس خانہ''، ''گنڈاسا'' اور ''آتش گل'' جن میں موضوع، فن اور شخصیت کی مکمل ہم آہنگی اور رچاؤ نمایاں ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ایک سیاسی اور مصلحانہ جوش و خروش نمایاں ہے۔ زندگی کے تضاد کو انھوں نے اسی فنی منطق کے ساتھ پیش کیا ہے جو ہمیشہ سے انھیں محبوب رہی ہے۔ مہندر ناتھ کے افسانوں کا موضوع انسانی زندگی کا معاشی پہلو، اس کی آرزوئیں، ناکامیاں، ذہنی الجھنیں، پیٹ کی بھوک اور اس سے بھی بڑی بھوک جنسی بھوک ہے۔ ہاجرہ مسرور نے اپنے افسانوں کے لیے ایسے موضوعات منتخب کیے ہیں جو تضحیک اور تمسخر کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ انسانی فکر اور عمل کے ان پہلوؤں کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کے رنگ میں ڈبو کر انھوں نے جتنے افسانے لکھے ہیں، ان میں فن کا نکھار اور تاثیر دونوں چیزیں موجود ہیں۔ ''اندھیرے اجالے'' اور ''امت مرحوم'' میں طنز کی یہ گہرائی اور بیان کی تازگی اور شگفتگی اور دردمندی کا ایک صالح جذبہ اور احساس موجود ہے۔

خدیجہ مستور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ایک دور کے ذہنی رجحانات اور فضا کی عکاسی ہے اور اسی لحاظ سے ان کا افسانہ ''محافظ الملک'' ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ''تلاش گمشدہ'' اور ''دادا'' میں بیزاری کے اس رجحان کی عکاسی ہے جو خارجی زندگی کے انتشار کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے فن پر اس دور میں بھی ایک بورژوا قسم کی رومانیت طاری رہتی ہے۔ ''وہی زمانہ''، ''اور ''میں نے لاکھوں کے بول سے'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کے

اس دور کے افسانوں میں بھی گرد و پیش کے ماحول کی بے شمار شاعرانہ تصویریں ہیں جن پر افسانہ نگار کے اس مخصوص فن کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

ممتاز مفتی نے جنسی اور نفسیاتی تجزیہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور اس طرح کہ ایک بدنام چیز ایک علمی چیز بن گئی۔ بلونت سنگھ نے پنجابی دیہات کے ٹھیٹ پن کو اپنا موضوع بنایا اور اس ٹھیٹ پن کو بڑے مخلصانہ اور لطیف انداز میں قاری تک پہنچایا ہے۔ ان کے افسانوں میں فکر کی گہرائی، تخیل کی رنگینی اور موضوع کی سادگی اور نزاکت پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

غلام عباس نے تقسیم سے پہلے جو افسانے لکھے تھے ان میں سکون، اطمینان، مستقل مزاجی اور ٹھہراؤ کی خصوصیتیں اس قدر نمایاں تھیں کہ وہ ان کے فن کا امتیاز بن گئی ہیں۔ موضوع کی تلاش اور اسے ایک مکمل شکل دینے کے درمیان افسانہ نگار کو جو بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں ان سب میں یہی سکون، ٹھہراؤ اور مستقل مزاجی غلام عباس کا فنی مطمح نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مطمح نظر تقسیم کے بعد کے افسانوں میں بھی ان کے آدرش کی بنیاد ہے۔ ساجد، اس کی بیوی اور فینسی ہیر کٹنگ سیلون میں فکر، تخیل، تصور، احساس اور جذبہ ہر چیز نے اپنا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔

شفیق الرحمٰن کے افسانوں میں تقسیم کے بعد بھی ایک ہلکے پھلکے اور شگفتہ ماحول اور طرز کی ترجمانی ملتی ہے۔ قدرت شہاب کی نظر زندگی کے متنوع موضوعات پر ہے۔ اب بھی ان کے یہاں ایک جرأت اور بے باکی دیکھنے کو ملتی ہے۔

جن افسانہ نگاروں کا تذکرہ ابھی ہوا ہے ان کے ان کارناموں پر نظر ڈالنے پر کئی نتیجے نکلتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں میں سے اکثر نے موضوعات کی تلاش میں اپنے گرد و پیش کی زندگی کے واقعات اور اس کے مسائل کو اپنانے کے بجائے اسی ماحول کو اپنی کہانیوں کا پس منظر بنایا ہے جو مدتوں سے ان کی نظر میں بسا ہوا ہے۔ ان افسانوں کے ماحول، فضا اور پس منظر کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا دس، پندرہ، بیس برس پہلے جیسی تھی ویسی اب بھی ہے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویروں کے نقوش ہمارے لیے مانوس

ہیں۔ علی عباس حسینی اور مجنوں گورکھپوری سے لے کر ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی اور سعادت حسن منٹو تک بیشتر لکھنے والوں کا یہی حال ہے۔ یوپی کے دیہات، لکھنؤ کے متوسط گھرانوں کی بڑی بوڑھیاں، مسوری کے ہوٹل اور ناچ گھر، شریف مسلمانوں کے بچوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے گھرانے، پنجابی گاؤں، ان کے کھیت کھلیاں اور چوپال، بمبئی کی کھولیاں، اور قحبہ خانے، ان سب سے ہم مدتوں اچھی طرح واقف رہے ہیں اور یہی سب چیزیں تقسیم کے بعد کے افسانوں میں بھی بار بار سامنے آتی ہیں۔

بعض افسانہ نگاروں نے ماضی کے مشاہدات اور تصورات سے ہٹ کر جب حال کی زندگی کو اپنانا چاہا تو انھیں تقسیم کے اردگرد کے خونیں واقعات کے سوا اور کوئی بات کہنے کو نظر نہ آئی۔ اس موضوع پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں لیکن ان کی حیثیت عارضی تاثر کی ہے۔ زندگی کے نقوش کی گہرائی اور فن کی ابدیت کے عناصر ان میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں سے بہت کم نے زندگی کے مسائل پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے اور منتشر اور مضطرب زندگی کو روشن مستقبل کی نوید و بشارت کسی نے نہیں دی۔ کسی اونچے آدرش کا راستہ کسی نے نہیں دکھایا۔

موضوع سے الگ ہٹ کر اسلوب اور فن کے نقطۂ نظر سے بھی ان افسانہ نگاروں میں سے کسی کے یہاں کسی نئی منزل کا نشان نہیں ملتا ہے۔ ہر لکھنے والے کی ایک الگ ڈگر ہے۔ اس ڈگر اور راستے پر چلتے رہنے میں ان لوگوں نے اپنی عافیت سمجھی ہے۔ کہیں کہیں جدت کے نقوش ملتے ہیں۔

لکھنے والوں کے لہجے میں ایک جرأت رفتہ کہیں کہیں (مثلاً کرشن چندر، منٹو، ہاجرہ مسرور قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی وغیرہ) نظر آتی ہے لیکن لہجے کی اسی جرأت میں حالات کی تیزی اور تندی نے تلخی پیدا کر دی ہے۔

☆☆

ماقبل منٹو۔ اردو افسانہ

اردو ادب میں مختصر افسانے کی بنیاد قائم کرنے کا سہرا منشی پریم چند کے سر ہے۔ ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''سوزِ وطن'' طبع زاد اردو مختصر افسانوں کی پہلی کتاب ہے جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ پریم چند کا مختصر افسانہ تجربے اور روایت کی جن مختلف منازل سے گذرا ہے ان کو ناقدین کئی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور تو ''سوزِ وطن'' سے شروع ہوتا ہے جن میں قارئین کو عمیق مقصدیت اور شدید جذباتیت اور طرزِ نگارش اور اندازِ بیان پر اردو کی قدیم داستانوں کی مبالغہ آرائی، رنگینی اور غیر فطری کیفیت نظر آتی ہے۔ آگے چل کر ''پریم پچیسی'' اور ''پریم بتیسی'' کی تاریخی اور معاشرتی کہانیوں سے مصنف کے نقطۂ نظر کی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں جذباتیت اور مقصدیت تو ضرور ہے البتہ داستانوں کا غیر فطری عنصر بہت کم ہوگیا ہے۔ پریم چند آگے بڑھے اور اس دور میں ان کو تاریخ سے زیادہ اردگرد کی زندگی میں جاذبیت اور دلچسپی معلوم ہوئی۔ مقصدیت میں بھی وسعت پیدا ہوگئی اور اس کا اظہار معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی میں ہوا۔ اب طرزِ ادا میں داستانی اندازِ بیان اب بھی موجود ہے۔ بعد میں انھوں نے خاص طور پر عصری واقعات اور ماحول کی عکاسی پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اس دور میں ان کے خیالات میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی۔ اب سماجی، اخلاقی اور سیاسی مسائل ان کے مختصر افسانوں کے موضوع بن گئے اور ان کے لہجے میں دھیما پن آ گیا۔

اپنے آخری دور میں پریم چند نے پلاٹ کو ثانوی حیثیت دی اور کردار نگاری کی اہمیت پر زیادہ زور دیا۔ اس زمانے میں بھی انھوں نے اشخاص کو اپنے مختصر افسانوں کا موضوع

بنایا ہے۔ اب ان کی نگاہ اس کے خارجی پہلو سے ہٹ کر داخلی کیفیات پر آ گئی۔ انھوں نے اس دور میں حقیقت کو فن کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے اور اپنی تخلیقات کو اپنی انفرادیت کا مکمل مظہر بنا دیا ہے۔ پریم چند کی مختصر افسانہ نگاری کے یہ ادوار در اصل اردو مختصر افسانے کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں اور ان مختلف منازل کو پریم چند نے ایک تنہا مسافر کے مانند کبھی طے نہیں کیا ہے بلکہ ہر دور میں اردو مختصر افسانہ نگاروں کی ایک بڑی جماعت ان کے ہمراہ رہی ہے جس کے ہر رکن نے ان کے قائم کیے ہوئے راستوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں ان کے ساتھ سدرشن رہے۔ تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی اور تیسرے دور میں ہی بے شمار اردو مختصر افسانہ نگاران سے متاثر نظر آتے ہیں، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، حامد اللہ افسر، اختر انصاری ان میں چند ہیں۔

پریم چند کی مختصر افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ ہی تھا کہ سلطان حیدر جوش نے مسلمانوں کو مغربیت کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لیے اصلاحی مختصر افسانے لکھے۔ انھوں نے اس کے ذریعے نوجوان مسلمانوں میں مغرب اور اس کی ظاہری زرق برق زندگی کی ناپائیداری کا احساس پیدا کرنا چاہا۔ سلطان حیدر جوش نے اپنے مختصر افسانوں میں وہی کام کیا جو اکبر الہٰ آبادی نے اپنی شاعری میں کیا۔ ان کا طنز لطیف استہزا روزمرہ کا چٹخارہ ان کے اصلاحی مختصر افسانوں کے وہ اوصاف ہیں جو نصیحت کی تلخی اور خشکی کچھ حد تک زائل کر دیتے ہیں۔ ان کے مختصر افسانوں میں ''خواب و خیال'' اور ''عالم ارواح'' ان خوبیوں کے اچھے نمونے ہیں۔ چونکہ مختصر افسانہ اردو ادب میں مغرب کے اثر کا نتیجہ ہے۔ اس لیے مختصر افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے ہی اردو میں بہت سے ایسے مختصر افسانے بھی لکھے گئے ہیں جن پر اصلاحی باتوں یا قومی تحریک کا کوئی اثر نہیں ہے بلکہ بیشتر انگریزی کی وساطت سے مغرب کی مختصر افسانہ نگاری کی ایک خاص روش کے تحت تخلیق کیے گئے ہیں اور چونکہ یہ خاص روش داستانی طرز سے بہت مماثلت رکھتی تھی اور اس میں افسانوی لحاظ سے وہی رنگینی اور لطافت تھی جو اردو کے قدیم قصوں میں پائی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے بعض مختصر افسانہ نگاروں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے اسے اپنا لیا اور کبھی اسی نوع کے طبع زاد مختصر افسانوں سے

اور کبھی ترجموں سے اردو مختصر افسانے کے دامن کو وسیع کر دیا۔ اس خاص روش کے مختصر افسانوں میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رومانی کہانیوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

سجاد حیدر کے مختصر افسانے ''ملوپٹرہ''، ''جہاں پھول کھلتے ہیں''، ''میں چاہتا ہوں میرے بعد'' ''قاہرہ کو دیکھ کر'' اور نیاز فتحپوری کے مختصر افسانے ''کیوپڈ اور سائکی'' ''زہر محبت'' اور ''صحرا کا گلاب'' اس روش کی قابل قدر مثالیں ہیں۔ ل. احمد اکبرآبادی نے بھی اپنے مختصر افسانوں کو لطیف پیرائے میں بیان کر کے اس روایت کو تقویت پہنچائی ہے اور بعد میں حجاب امتیاز علی تاج نے اپنی رومانی کہانیوں میں انسانی زندگی کے لطیف جذبات و واردات کی عکاسی کر کے اس روش میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ ان کے مختصر افسانے ''صنوبر کے سائے'' اور ''میری ناتمام محبت اس روش کے اچھے نمونے ہیں۔ انھوں نے ایڈگر ایلن پو کے بعض ہیبت ناک مختصر افسانوں سے متاثر ہو کر ''لاش'' ''نیلا لفافہ'' اور ''اس کا ہاتھ کٹا تھا'' رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں ہیں۔ انھوں نے ان کہانیوں کو لکھ کر اردو کے مختصر افسانوی ادب میں کشادگی پیدا کر دی ہے۔

مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر اپنا علاحدہ رنگ قائم کرنے والوں میں مجنوں گورکھپوری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی نظر کے سامنے بہت سے وہ اسرار ہیں جن کی تحقیق میں کوئی ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔ مثلاً ''جبر و اختیار''، ''نیکی اور بدی'' اور زندگی اور موت کے مسائل ایسے ہیں جن پر ادب نے بہت غور و خوض کیا لیکن کچھ تشفی آمیز نتائج نہ برآمد ہو سکے۔ مجنوں نے انھی موضوعات پر اپنے مختصر افسانوں میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ محبت اور اخلاق کے وہ نازک مسائل ہیں جن پر بحث کرنا ادیب مناسب نہیں سمجھتے مجنوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے محبت کے جذبات سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کردار نگاری کی کمزوریاں ہیں۔ فلسفہ کی بے موقع بحثیں ہیں۔ قطع نظر ان کمزوریوں سے جو چیز سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ ان کا طرز تحریر اور افسانوی دلکشی ہے جو قارئین کو حد درجہ متاثر کرتی ہے۔ ان کہانیوں میں شکست بے صدا'' اور ''خواب و خیال'' بلند درجے کی کہانیاں ہیں۔

مغرب میں مختصر افسانہ نگاروں کے دو دبستان قائم ہو چکے تھے۔ ایک تو فرانسیسی جلیل القدر مختصر افسانہ نگار موپاساں اور دوسرے روسی شہرہ آفاق انشا پرداز چیخوف کا۔ اردو میں انگریزی کی وساطت سے ان دونوں کے بہت سے مختصر افسانوں کے ترجمے ہوئے۔ پروفیسر محمد مجیب کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''کیمیا گر'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نو مختصر افسانے ہیں جن میں سے بیشتر پر روسی طرز کا گہرا اثر ہے۔ ان میں ہندوستان کی زندگی کے بعض ذہنی پہلوؤں کی عکاسی بھی ہے اور اس زندگی پر ہلکی سی طنز بھی ہے۔ گو ان میں احساس کی شدت ہے لیکن جذباتیت ذرا بھی نہیں ہے۔ اظہار احساس میں ہر مقام پر ادبی توازن ہے۔ مصنف نے طنز میں بھی سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ یہ کہانیاں درحقیقت ذہنی زندگی کی حقیقی اور بے لوث تصویریں ہیں جن میں انسانی عمل کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس طرز کا ہلکا ہلکا سا اثر ہمارے بعض مختصر افسانہ نگاروں کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''محبت اور نفرت'' ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ مجموعہ اردو میں اسی امر کی واضح مثال ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور عمرانیت بدلتی گئی مختصر افسانے کا فن کس طرح تبدیل ہوتا گیا۔ کتاب کا پہلا حصہ محبت کے رنگین مختصر افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں شعریت ہے، خلوص اور شدت احساس ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فکر کی گہرائی ہے۔ فنی لطافت ہے، ایمائیت ہے اور معنی آفرینی ہے۔ یہی افکار قارئین کو بتاتے ہیں کہ محبت رومان انگیز بھی ہے اور ساتھ ہی دھوکہ، مکر اور فریب میں یہ مبتلا کر دیتی ہے اور ان ہی خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا ماحصل کیا ہے۔ محبت زندگی کے تکدر اور موت کی تلخی کو جاذبیت اور حلاوت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہی نقطۂ خیال ہے جو ان شاعرانہ کہانیوں پر چھایا ہوا ہے۔ مگر اس مجموعے کے وہ مختصر افسانے جو نفرت کے جذبے پر مشتمل ہیں۔ محبت کی کہانیوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں زندگی کی تلخیاں و ناکامیاں ہیں۔ ظلم اور مظلومیت کی کشاکش ہے۔ ننگی طوائفیں ہیں، اندھے بے نوا فقیر ہیں، فاقہ کش مزدور ہیں، سرمایہ دار ہیں اور ان کے پاؤں تلے روندی ہوئی مفلوک الحال انسانیت ہے۔ اختر حسین رائے پوری نے اپنے مختصر افسانوں سے نیا راستہ کھولا ہے۔ آنے والے مختصر افسانہ نگاروں نے اس راہ

پر بھی گامزن ہو کر مختصر افسانہ نگاری میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔

انھی جدید میلانات کا اثر تھا کہ پریم چند نے اپنے آخری دور میں ''کفن'' جیسا مختصر افسانہ تخلیق کیا اور ۱۹۳۶ء میں ''انگارے'' جیسے افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اس میں اس وقت کے تمدن و معاشرت سے بیزاری کا اظہار ہے اور نئی زندگی کی تلاش اس سے عیاں ہے۔ ۱۹۳۰ء میں مغربی دنیا ایک زبردست معاشی بحران سے گزر رہی تھی۔ اس بحران نے دنیا کے گوشے گوشے کو متزلزل کر دیا تھا۔ دنیا کا تمام سماجی اور معاشی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ اس انتشار نے اہم سیاسی نتائج پیدا کیے تھے۔ آخر کار ۱۹۳۵ء میں اس جدوجہد نے ایک منظم ادبی تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ترقی پسند ادب کی تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ امریکہ، انگلستان، فرانس، اسپین، سوئزرلینڈ اور چین کے ادیبوں نے پہلی بار منظم ہو کر زندگی کو بہتر بنانے کا مستحکم ارادہ کیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ زندگی کے تمام مصائب کا باعث ایک سیاسی نظام ہے جو سامراج اور فاشیت کے اصولوں پر قائم ہے۔ وہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اس نظام کو ختم کر دینے کے لیے متفقہ طور پر کوشاں ہو گئے۔ اس نظریے نے ادب میں سماجی اور سیاسی جذبے کی لہر دوڑا دی اور ادبیات عالم نے ایک متحد قوت بن کر تخریبی قوتوں کو توڑنے کا بیڑا اٹھایا۔

اس عالمگیر تحریک کا اثر سرعت کے ساتھ اردو ادب میں سرایت کرنے لگا۔ کیونکہ ہمارے بعض ادیبوں کو انگلستان میں براہ راست ان جدید ادبی سرگرمیوں میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے انگلستان سے واپس آ کر ہندوستانیوں کو اس ادبی تحریک سے روشناس کرایا۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۳۶ء میں پہلی دفعہ ہندوستان کے مختلف مقامات لکھنؤ، الہ آباد، دہلی، لاہور، کلکتہ اور بمبئی میں ترقی پسند ادیبوں کی جماعتیں منظم ہوئیں۔ اس تحریک کی سرگرمی میں ہمارے شعرا سے زیادہ ہمارے مختصر افسانہ نگاروں نے دلچسپی لی اور اس کا اچھا یا برا اثر ان کی تصانیف میں شدت کے ساتھ نمایاں ہوا۔

ترقی پسندی کی تحریک کے باقاعدہ وجود میں آنے سے پیشتر ہی ہندوستان کی ادبی فضا میں اس کے آثار خود بخود نمودار ہو رہے تھے۔ ہمارے کئی مختصر افسانہ نگار ایسی

کہانیاں لکھ چکے تھے جو ترقی پسند تحریک کے منظر عام پر آنے کے بعد آسمان ادب پر سرعت کے ساتھ چھا گئیں۔ ان مختصر افسانوں نے غیر شعوری طور پر اردو افسانوی ادب میں بالکل نئے رجحانات کی بنیاد قائم کی تھی۔ پریم چند کا مختصر افسانہ ''کفن'' پروفیسر مجیب کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''کیمیا گر'' اختر حسین رائے پوری کا مختصر افسانہ ''محبت اور نفرت'' سجاد ظہیر، رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' اور نیاز فتحپوری کا مختصر افسانہ ''جنت کی حقیقت'' میں جدید میلانات کے بعض وہ عناصر موجود ہیں جو ترقی پسندی کی تحریک سے مشابہ ہونے والے مصنفین کے ما بہ الامتیاز اوصاف ہیں۔

مختصر افسانوں کی کتاب ''انگارے'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کل دس مختصر افسانے ہیں، دو رشید جہاں، پانچ سجاد ظہیر، دو علی احمد اور ایک محمود الظفر کا۔ سجاد ظہیر اور احمد علی کی کہانیاں تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے جیمس جوائس اور لارنس کے فن سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان میں کوئی پلاٹ نہیں ہے۔ متعدد بے ربط تصویریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ خیالات کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈتا، پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا آتا ہے۔ ذہنی کیفیات کی بوقلمونی ہے، عجیب و غریب شخصیتیں ہیں، شدید احساس اور تلخ طنز کی فراوانی ہے، خیال کی بے باکی اور آزادی ہے، شوخی اور جھنجھلاہٹ ہے، تمسخر اور ابتذال ہے۔ ''انگارے'' کے تمام مصنفین کے یہاں فن میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کی اس انتہا پسندی نے ان کے فن کو سخت ٹھیس پہنچائی لیکن یہ ایک تجربہ تھا بعد میں یہ لوگ بہت کچھ سنبھل گئے، بلکہ بعض نے تو اپنا انداز بالکل ہی بدل دیا۔ پھر بھی یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان مصنفین نے جہاں جہاں روایت کی شدت سے خلاف ورزی کی ہے اس کا اثر آئندہ لکھنے والوں پر اچھا نہیں ہوا۔ یہ امر مسلم ہے کہ ''انگارے'' کے مصنفین نے آنے والے مختصر افسانہ نگاروں کے لیے آزاد اور بے جھجک نشتر زنی کا راستہ کھول دیا۔ جس طرح ''انگارے'' کے مختصر افسانوں میں ہندوستانیوں کی مختلف جماعتوں کے راسخ عقیدے کے خلاف باتیں کی گئیں، ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی اور جنسی موضوعات پر بیباکی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعد میں آنے والے مختصر افسانہ نگاروں میں بعض نے اپنی کہانیوں میں خاصی

بے اعتدالی کا ثبوت دیا ہے۔ منٹو کی کہانی ''ٹھنڈا گوشت'' ''کالی شلوار'' ''بو'' اور عصمت چغتائی کی کہانی ''لحاف'' اس کی بین مثالیں ہیں۔

۱۹۰۷ء سے ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۵ء تک اردو مختصر افسانے کے فن میں جو روایات قائم ہوئیں ان کا اندازہ پریم چند کے ''کفن'' اور ''انگارے'' کے مختصر افسانوں کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے اردو مختصر افسانہ نگاروں کو سکھایا کہ انھیں زندگی کی بابت کس طرح لکھنا چاہیے۔ ''انگارے'' نے انھیں یہ سبق دیا کہ کس طرح فرسودہ طریقوں سے علاحدہ ہو کر نئی راہوں کو اپنانا چاہئے اور یہ کہ روزمرہ کی معمولی زندگی پر کس طرح سے اچھا مختصر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت تک مختصر افسانہ نگاروں نے انگریزی کی وساطت سے مغربی مختصر افسانوں کا غور سے مطالعہ کر کے اپنے یہاں ان کی خصوصیات کو اپنا کر نئی راہیں کھول دیں۔ مغربی کہانیوں کے ترجموں سے اردو کے افسانوی ادب میں بڑا اضافہ ہوا۔ فن کے جس رجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں نے اردو مختصر افسانہ نگاروں میں پیدا کیا تھا۔ اسے جلیل احمد قدوائی، خواجہ منظور، بشیر الدین اور منصور احمد وغیرہ نے جلا دی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء تک حقیقت نگاری، رومانی انداز اور فنی شعور نے ہمارے مختصر افسانوں کو ادب میں ایک عظیم المرتبت حقیقت بخش دی۔ پریم چند کے مختصر افسانوں کی مختلف خصوصیات، ترقی پسند تحریک کا معاشی نظریہ اور اس نظریے کی پیدا کی ہوئی زندگی کے پرورش کردہ نئے نئے خیالات اور ''انگارے'' کے آزاد اور بے باک انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں۔

عہد منٹو ـ رجحانات و میلانات

رومانی دبستان کو محض ماورائی اور جذباتی کہنا مناسب نہ ہوگا۔ یلدرم، نیاز فتح پوری، حسن عزیز، جاوید احمد، ل. احمد اکبرآبادی اور پھر بعد میں مجنوں گورکھپوری، حجاب امتیاز علی، والدہ سراج الدین ظفر اس رومانی دبستان سے وابستہ ہیں۔ صادق الخیری، اے حمید اور خود کرشن چندر کا پہلا دور رومانی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں فکر اور پر خیال عناصر بھی ہیں اور واہمہ تصور قیاس اور ماورائیت بھی ہے۔ یہ ادب تخیلی ادب ہے جس میں رومانیت کے مختلف عناصر ہیں۔ یلدرم اردو افسانوی دنیا میں اس کے امام ہیں۔ تخیل اور جذبے کی فراوانی کی وجہ سے کبھی کبھی شدید قسم کا ماورائی آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ تخیل ہر فنکار کا اساس ہوتا ہے۔ یلدرم اور دوسرے رومانی افسانہ نگاروں نے بعض قدیم روایتوں سے علاحدہ ایک راستہ دکھایا۔ یہ راستہ دھندلا ضرور ہے لیکن یہ کیوں فراموش کردیں کہ یہی رومانوی ادب کی بنیاد بھی ہے۔ ان کی ماورائیت کے پردے کو ہٹا کر دیکھیں تو ایسے عناصر بھی موجود ہیں جن کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ جذباتی تشنگی بجھانے کے جو ذرائع استعمال کیے گئے ہیں ان کا احترام کرنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ان راستوں کو بھی دیکھنا ضروری ہے جن راستوں سے حسن کی تلاش کی گئی ہے۔ جمالیاتی تاثر کو سمجھنے کے لیے ان تمام راہوں کے نشیب و فراز کو سمجھنا ہوگا۔

یلدرم کی رومانی قدروں کی پوری پیروی نیاز فتح پوری نے کی ہے۔ یہاں فکر میں ندرت اور تخیل میں رنگینی پیدا ہوتی ہے۔ پہلے دور میں افسانوں کا رنگ کم و بیش وہی ہے جو یلدرم کا ہے۔ نیاز نے عورت کی تمثیلی تصویر پیش کی ہے۔ ان کے یہاں عورت اپنی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ نظر ہی نہیں آتی بلکہ ایک دل فریب رومانوی لباس میں ملتی ہے۔ مجموعی

طور پر عورت میں جو جنسی اور جذبی نسائیت پائی جاتی ہے وہ مبالغے کے ساتھ یلدرم، سجاد علی انصاری اور نیاز فتحپوری کے یہاں ہے۔

نیاز بہت عمدہ فضا پیدا کرتے ہیں لیکن کردار نگاری میں غور و فکر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کرداروں کی بعض ادائیں اجنبی ضرور ہیں لیکن ان کے جذبات زیادہ اجنبی نہیں۔ واقعیت کو پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہی نہیں کبھی کبھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ داستانیت کا اثر ہر جگہ موجود ہے۔ داستانوں کے واقعات تھوڑے سے ماحول کی تبدیلی کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں بھی یہی رنگ اور انداز ملتا ہے۔ ''شاعر کا انجام'' (ناولٹ) اور ''شہاب کی سرگذشت'' (ناول) میں بھی یہی فضا ملتی ہے۔

پریم چند کے زمانے میں اس رجحان کو ہم محض ''ادب لطیف کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی کی مغربی رومانیت پر سجاد حیدر کی مشرقی رومانیت اور نیاز فتحپوری کی کلاسیکی رومانیت کا گہرا اثر ہے۔ رومانوی دبستان میں فن برائے فن ہی سب کچھ نہیں ہے۔ تکنیک کے مختلف تجربے یہاں ملتے ہیں۔ مختلف انداز فکر اور نیا پن پیدا کرنے کا جذبہ ہر جگہ موجود ہے۔ نیاز کے یہاں ہمیں رومانیت کے ساتھ سماجی کمزوریوں پر تنقید ملتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کہتے ہیں—

> ''چونکہ ٹھوس سماجی حقائق سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے ان میں کوئی جان پیدا نہیں ہو سکی اور اس دور کے افسانہ نگاروں کی کہانیاں بہت جلد پھیکی اور باسی ہو کر رہ گئیں۔ اس رجحان نے ایسے شگوفے ضرور چھوڑے جن کی مہک بعد میں آنے والے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں بھی مل جاتی ہے[1]''

مغربی تحریکوں اور مغربی رومانیت کی وجہ سے اس میں زیادہ پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کلاسیکی اور مشرقی رومانیت مغربی رومانیت میں جذب ہوتی ہے لیکن اپنے بعض نقوش گم نہیں کرتی۔ یلدرم اور نیاز کی روایت اور آگے بڑھتی ہے اور مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز

---

[1] اردو افسانہ نگاری کے رجحانات مطبوعہ (شعور کراچی)

علی کے افسانے اس کی مثال ہیں۔

مجنوں نے ہارڈی کے اثرات قبول کیے ہیں۔ ان کے المیہ افسانے اپنی گہری سنجیدگی اور جذبات نگاری کے لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اس پورے دور میں جذبات نگاری اور المیہ کیفیتوں کی سب سے اچھی مثالیں مجنوں کے یہاں ملتی ہیں۔ مجنوں کے سامنے انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانے رہے ہیں۔ انھوں نے دوسری زبانوں سے ترجے بھی کیے اور بعض مغربی افسانوں کے مرکزی خیال کو لے کر اردو میں افسانے بھی لکھے۔ ''سمن پوش''، ''حسن عروسی''، ''فن تمنا اور ''بیگانہ'' کے بنیادی خیالات مجنوں کے اپنے نہیں ہیں۔ اس کا اعتراف انھوں نے خود ''خواب وخیال'' کے دیباچہ (صفحہ ۲۴) میں کیا ہے۔ مجنوں کے طبع زاد افسانوں میں رومانوی تفکر ہے۔ قیاس آرائی اور تخیل میں بھی ان کے رومانوی ذہن کی بیقراری دیکھی جاسکتی ہے۔

زندگی کے مستقبل کے بارے میں کچھ جاننے اور سوچنے کی فکر بھی ہے۔ زندگی اور انسان کی تلاش ہے۔ جذباتیت اور جذباتی نفسیات جو اس زمانے میں مغربی ادب کی بہت بڑی چیز تھی، دراصل یہ اس کا اثر تھا۔ رومانیت کا اظہار ایک نئے ڈھنگ سے ہوا تھا۔ زمان ومکان کا تصور اس رومانیت سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی رجحان غالب ہے۔ تخیل اور رومانیت کا اظہار ایک نئے ڈھنگ سے ہوا تھا۔ زمان ومکان کا تصور اس رومانیت سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی رجحان غالب ہے۔ تخیل اور رومانیت کا اثر پورے طور سے اس دور میں اور کہیں نہیں ملتا۔ فلسفیانہ رنگ شامل ہوتا ہے تو فضا بوجھل نہیں ہوتی۔ زندگی کی یکسانیت سے گھبرا کر مجنوں جو رومانیت پیدا کرتے ہیں اس میں ہندوستانی زندگی کے رسم ورواج کی زنجیریں بھی ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔ عشق ومحبت کو مقدس حقیقت سمجھ کر اس کے لیے نئی راہیں بناتے ہیں۔ مذہب اور ملت کے اصول بھی ان کے افسانوں میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ زندگی کے غم کا احساس بہت گہرا ہے۔

حجاز امتیاز علی کے یہاں رومانیت پراسرار طلسمی فضا میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ''ادب لطیف'' کے نہایت ہی دلفریب نمونے ملتے ہیں اور ساتھ ہی افسانوں میں جذبات

فلسفہ سے علاحدہ نظر آتے ہیں۔ حجاب نے شعریت کے سہارے ایک خاص طرز کو پیدا کیا اور آج تک یہ انداز قائم ہے۔

ان کے افسانوں میں روشنی اور تاریکی کا زیر و بم، محبت کی خلش اور فراق کا درد ہے۔ چند خاص کردار ہیں جو بار بار ملتے ہیں۔ ان کے اسلوب پر ان کی شخصیت چھائی ہوئی ہے۔ رومانیت جذبات کی فراوانی اور حسن کی معصومیت سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کے تمام افسانوں میں تسلسل ہے۔ ان کے افسانوں کا ہر کردار اپنے آپ سے بے خبر ہے۔ ڈاکٹر گار، روناش یزدانی، مشہدی یہ سارے کردار مشرقی پس منظر میں ابھرتے ہیں لیکن مغربی رومانیت کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کے کرداروں کا اپنا غم اس حد تک رومانی ہے جس حد تک ان کی خوشی۔

حجاب امتیاز علی کی رومانیت ایڈونچر کے ذریعے بھی سامنے آئی ہے۔ ''لاش اور دوسرے افسانے'' اور ''کونٹ الیاس کی موت'' میں رومانیت کا اظہار ایک نئے ڈھنگ سے ہوا ہے۔ پراسرار طلسمی فضا اردو افسانوں میں پہلی بار یہاں ملتی ہے۔ حقیقت نگاری کا نہایت ہی اہم پہلو وہاں نمایاں ہوتا ہے۔ یہاں ظرافت میں بھی تازگی ہے۔ ''تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے'' حجاب کے رومانی ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔

اردو افسانوی ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے کا فخر منشی پریم چند کو حاصل ہے۔ ان کے سب افسانے ہماری روزمرہ زندگی کی حقیقی اور بے لوث تصویریں ہیں اور ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی داستان حیات کے کسی واقعے کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے ذرے ذرے تحقیقی نگاہ ڈالی، انھوں نے تمام جسمانی، نسلی، قومی، سماجی اور روحانی خصوصیت کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات کو اپنے افسانوں میں بیان کر دیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنے اردگرد کی دنیا کا سچا نقشہ کھینچ دیں اور انسانی زندگی کی حقیقت کو بے نقاب کر دیں۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی تعداد حقیقت نگاری کی اچھی مثال ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع طبقۂ عوام ہے جس کی داستان حیات کو انھوں نے نہایت صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حقیقت نگاری کی اس خصوصیت کے باعث اکثر ناقدین نے پریم چند کی زندگی کا عکس ان کے افسانوں میں تلاش کیا ہے۔

حقیقی ادب زمانہ، ملک اور ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے پریم چند کے افسانے عصری واقعات اور ان کے حالات کے جو ہندوستان میں رونما ہوئے اس کے حقیقی آئینہ دار ہیں۔ ملکی تحریکوں کا اثر ان کی تحریروں میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی رسم و رواج، مذہبی اعتقادات اور تہذیب و تمدن کے سچے نقشے اپنے افسانوں میں کھینچے ہیں۔ ان کے مطالعے سے غیر ملکی قارئین بھی یہاں کی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی افسانے میں یہاں کے مذہبی رسوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً ''زادراہ''۔ پریم چند ایک زبردست حقیقت نگار تھے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے اسی زندگی کو منتخب کیا جس سے وہ بخوبی واقف تھے اور انھی چیزوں کی تصویریں کھینچی جن کے متعلق ان کو صحیح اور اصلی معلومات حاصل تھیں۔ ان کی کامیابی کا راز زندگی سے ان کی ذاتی واقفیت میں پوشیدہ ہے۔

جہاں تک دیہاتی زندگی کی مصوری کا تعلق ہے ان کے سر اولیت کا سہرا ہے۔ انھوں نے دیہات کے جن جن مناظر کا نقشہ کھینچا، اس طرح کھینچا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو بہو تصویر آ جاتی ہے۔ یہ پریم چند کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر دیہاتی معاشرے کی ہو بہو مرقع کشی کی ہے۔ کیونکہ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں اپنے بچپن کا زمانہ گزارا تھا۔ اس سبب وہ دیہاتی ماحول سے بخوبی واقف تھے۔ کسانوں کی خستہ حالی، زمینداروں، مذہبی ٹھیکیداروں، پولیس والوں اور سرمایہ داروں کے مظالم کا حال پڑھ کر دل کو حد سے زیادہ قلق ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت نگاری کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وہاں چند ایسے دلکش مناظر پیش کر دیتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے دلوں پر چھائے ہوئے غم کو رفع کر دیتے ہیں۔

پریم چند کے یہاں حقیقت نگاری کا اظہار صرف موضوع انتخاب ہی میں نظر نہیں آتا بلکہ طرز ادا میں بھی موجود ہے۔ انھوں نے عبارت آرائی سے اجتناب کیا۔ انھوں نے تشبیہوں اور استعاروں کو ہاتھ نہیں لگایا بلکہ روزمرہ کی زبان میں جسے زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدوں کو مختصر افسانوں میں ظاہر کیا ہے۔

یہی رجحان علی عباس حسینی، اعظم کریوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ میں پیدا ہوا۔ وہ جس ماحول اور جس معاشرہ میں رہتے ہیں اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس نظریے کے علمبرداروں نے ہیئت اور موضوع دونوں کے لحاظ سے افسانوی دائرے کو وسیع کر دیا ہے۔ اس میں متنوع زندگی کا مکمل نقشہ نظر آتا ہے۔ فن کے اعتبار سے بھی انھوں نے اس کی صورت کو بہت نکھارا ہے اور یہ چیز قارئین کو بہت زیادہ متاثر کرتی ہے۔

حقیقت پسندی کا یہ رجحان تو موجودہ دور کے ہر مختصر افسانہ نگار کے یہاں ملتا ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص نوع کی حقیقت نگاری کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان لوگوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے قریبی تعلق رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر ان کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ درحقیقت زندگی سے قربت ہی اس حقیقت نگاری کا اصل سبب ہے۔ یہ رجحان آج کل کے مختصر افسانہ نگار کے یہاں عام ہے۔ مثلاً حسینی، سدرشن، اختر اورینوی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، ندیم، عصمت، بیدی کے افسانوں میں واقعیت کی طرف خاص طور پر توجہ ہے۔

واقعیت پسندی کے زیر اثر ان افسانہ نگاروں نے اپنے ماحول کی عکاسی بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ چونکہ ماحول کے وسیع دامن میں طبقاتی، قومی اور سیاسی تحریکات شامل ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے موجودہ افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے یہاں انسانی زندگی کی بدحالی، سماجی مذمومات کے تاثرات'' ، قومی واقعات، بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔

جدید مختصر افسانوں میں حقیقت پسندی کی وجہ سے زندگی کا اس قدر سچا اور مکمل نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس سے بیشتر قدیم زمانے کی کسی تصنیف میں نظر نہیں آتا۔ ان افسانوں میں جا بجا زندگی کے پیچ در پیچ اور پر خطر راستے دکھائی دیتے ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے مختصر افسانے کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ان میں واقعات وہی بیان کیے جاتے ہیں جن سے آئے دن ہم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کردار افسانہ بھی مافوق الفطرت ہستیاں نہیں بلکہ یہی عام انسان ہیں جن سے ہماری دنیا آباد ہے۔ یہ گوشت پوست کے واقعی انسان ہیں۔ ان

کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل اور ان کی رگوں میں گرم گرم خون دوڑتا نظر آتا ہے۔

ہمارے یہاں کے جدید حقیقت پسند مختصر افسانہ نگار خواہ پریم چند کے اثر سے خواہ مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر حقیقت زندگی پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا صرف خوبصورتی ہی سے معمور نہیں بلکہ اس میں جگہ جگہ بدصورتی کے بدنما داغ بھی نمایاں ہیں۔ ان دونوں رخوں پر وہ اپنے افسانوں میں روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ حسن وعشق کے معاملات میں بھی ادب کے نظریے کی پابندی کرنے والوں سے مختلف ہیں۔ جنسی مسائل میں بھی حقیقتیں پیش کرنی ہوتی ہیں تو بعض بڑی جرأت سے پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے اس زبان میں بیان کرتے ہیں۔ جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ بآسانی سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کی تفسیر ہیں اور تنقید بھی۔ وہ مکمل زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

ایک جانب مغربی افسانوں کے اعلیٰ نمونے تھے دوسری جانب ''انگارے'' کی انقلاب انگیز کہانیاں، تیسری طرف پریم چند کا ہر لحظہ بڑھتا ہوا فنی ادراک تھا جو ''کفن'' میں رونما ہوا تھا اور چوتھی جانب ہندوستان کی سیال بے قرار پھوٹ پڑنے والی فضا تھی جو مکمل آزادی کے ساتھ اشتراکیت کے نعروں سے لبریز تھی۔ ان سب نے مل کر اس نئی تحریک کو جنم دیا جسے عام طور پر ''ترقی پسند تحریک'' کہا جاتا ہے۔ جس نے ہیئت پرستی، مریض رومانیت، ابہام، عدم مقصدیت اور زندگی سے بے تعلقی کے تصورات پر کاری ضرب لگائی اور ادب کو نیا خون دیا۔ اس تحریک کے رہنما پریم چند، ''انگارے'' کے مصنفین اور ان کے ہم خیال نوجوان ادیبوں کے علاوہ تمام باشعور ادیب تھے جو ہندوستانی ادب کو زندگی کی جدوجہد میں سرگرم دیکھنا چاہتے تھے۔ چاہے ان میں بعض کو اس تحریک کے بعض خیالات سے اتفاق نہ رہا ہو۔ اس تحریک کا سب سے گہرا اثر شاعری اور مختصر افسانے پر پڑا۔ اور غالباً افسانے پر شاعری سے بھی کچھ زیادہ۔ اس لیے ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو افسانہ غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ اس تیز رفتاری میں کبھی اس کے قدم استوار پڑے اور کبھی لرزیدہ۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سماجی حقیقت نگاری کے پردے میں جنسی بے راہ روی، لذتیت اور عریانی کو بھی جگہ ملتی گئی۔ افسانہ نگاروں کے شعور میں جنسی اور ترقی پسندانہ تصورات گڈمڈ ہو گئے

اور پریم چند کی روایت سے رشتہ جوڑنے کے باوجود لذتیت اور رومانیت کے وہ عناصر سماجی جبر وظلم کا بھیس بدل کر افسانوں میں داخل ہو گئے جو شعور کی عدم پختگی پر دلالت کرتے تھے۔ ترقی پسندوں کو اس خامی کا جلد ہی احساس ہو گیا۔ کیونکہ عریانی جنسی عدم توازن اور لاشعور کی مصوری سے ان کے سماجی ارتقا کے تصور کو نقصان پہنچتا تھا۔ اس لیے ان ترقی پسندوں نے جو باقاعدہ اس تحریک سے وابستہ تھے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی اور جنسی مسائل کو انھی حدوں کے اندر رکھا جو سماجی حقیقت نگاری پر مبنی تھے۔

جہاں تک تکنیک کا سوال ہے منٹو بڑا فنکار ہے۔ کرشن چندر افسانے کی تکنیک سے غفلت برتتے ہیں۔ بیدی کو افسانے کی تکنیک پر کرشن چندر سے زیادہ عبور حاصل ہے یہ درست ہے۔ بیدی اور منٹو کے افسانے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو معیار ہمیشہ ہمارے سامنے رہا ہے۔ لیکن یہ بات بھی غلط نہیں ہے کہ بیدی اور منٹو کے افسانے کے لیے یہی معیار اور تکنیک ضروری ہے۔ کرشن چندر، قدرت اللہ شہاب، غلام عباس، ممتاز مفتی، انتظار حسین اور شوکت صدیقی کی تکنیک بھی افسانے کی تکنیک ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی تکنیک کو ایسی کامیابی کے ساتھ برتتے ہیں جس طرح سے منٹو اور بیدی برتتے ہیں۔ بیدی اور منٹو کے کمزور افسانوں میں تکنیک کی جو کمزوریاں نمایاں ہیں اور جو جھول پیدا ہو گیا ہے وہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں بھی ہے نقطۂ نظر کی کمزوری اور حقیقت سے گہری ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ فکر ونظر کی جہاں کارفرمائی ہے وہاں کرشن چندر، قدرت اللہ شہاب، اختر اورینوی، غلام عباس اور حسن عسکری نے بیدی اور منٹو سے اچھے افسانے لکھے ہیں اور جہاں موضوع میں وحدت نہیں رہی مرکزی نقطہ سے بات دور چلی گئی، حقیقت تک پہنچنے کے لیے متنوع راستوں کا خیال نہ کیا گیا وہاں اثر آفرینی باقی نہ رہی۔ کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، ممتاز مفتی اور قدرت شہاب کے بعض ناکام افسانے ان کی مثالیں ہیں۔ غلام عباس اور نئی نسل میں انتظار حسین جس طرح افسانے کی تکنیک برتتے ہیں، ان سے حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے۔ غلام عباس کا افسانہ ''آنندی'' تو اس صدی کے بہترین افسانوں میں بھی شاید شمار کیا جائے۔ ''آنندی'' اور ''اوور کوٹ'' ان دونوں میں غلام عباس کی اپنی تکنیک ہے۔ یہ ایک

کامیاب تجربہ ہے۔ غلام عباس کا تنقیدی شعور ہمیشہ بیدار رہا ہے۔ وہ ہمارے جذبات کی خلیج کو پاٹ دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے احساسات منظم ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے وہ ہمارے ذہن کو پریشان نہیں کرتے۔ ہمارا ذہن یہ چاہتا ہے کہ اس معمولی واقعہ کی تہیں اجاگر ہوں اور جب اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہ معمولی واقعے ہماری زندگی کے بنیادی مسائل سے گہرے طور پر منسلک ہیں تو ہم چونک جاتے ہیں۔ غلام عباس تکنیک سے کھیلتے نہیں تکنیک ان کے مواد کے رگوں میں منجمد ہو جاتی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں بھی تکنیک کا گہرا احساس ملتا ہے۔ میں نے تکنیک کے سلسلے میں انتظار حسین کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ غالباً وہ پہلے افسانہ نگار ہی جنھوں نے داستانی روایتوں سے گہرا اثر لیا ہے۔ داستانی رنگوں کی آمیزش سے ان کی تکنیک جاندار ہو گئی ہے۔ جنسی کیفیتوں کا بیان وہ بھی کرتے ہیں لیکن کہیں لذت لینے والی بات نہیں ہے۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں۔ جنسی زندگی کو موضوع بناتے ہیں تو اس کے مطابق تکنیک کی تراش خراش ہوتی ہے۔ ”ٹھنڈی آگ“ اور ”آخری موم بتی“ کی تکنیک پر ان کے نقطۂ نظر کی گہری چھاپ ہے۔ دونوں میں اسلوب کے لحاظ سے مماثلت ہے لیکن واقعات مختلف ہیں اس لیے تکنیک کا انداز اور رنگ بھی بدل گیا ہے۔ میں منٹو سے انتظار حسین کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتی لیکن ایک اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ”کالی شلوار“، ”پھاہا“، ”بلاؤز“ اور ”ٹھنڈا گوشت“ میں لذتیت ہی سب کچھ ہے۔ صحت مند نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں ہے۔ مرکزی نکتے بے نقاب نہیں ہیں۔ تلخی برائے تلخی ہے۔ اس کے برعکس ”ٹھنڈی آگ“ اور ”ساتواں در“ میں ادبی قدروں کا خیال رکھا گیا ہے اور جنسی آلودگی نہیں ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ان کے بعض موضوعات نے تکنیک کے جو خاص ڈھانچے لیے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ پیشکش کے لیے ہمارے پاس کسی شے کی کمی نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تکنیکی معیار ایک نہیں ہے۔ اپنے نقطۂ نظر سے مختلف اشاروں اور علامتوں کی مدد لے کر ہر فنکار اپنا معیار آپ تیار کرتا ہے۔ اپنی تکنیک کو اپنے نقطۂ نظر اور اپنے تجربے کے مطابق منظم اور متوازن بناتا ہے۔ صرف تراش و خراش ہی میں فرق نہیں ہوتا ہے

بلکہ خیال اور تصور سے لباس کے رنگ اور کپڑے بدل جاتے ہیں۔ اس سے کوئی انتشار پیدا نہیں ہوتا اگر تکنیک کے چند بندھے ٹکے اصولوں پر عمل کیا جائے تو مواد کو تکنیک کا محتاج اور بہت حد تک غلام بن جانا ہوگا۔ تخلیقی ارتقا نہیں ہوگا۔ تکنیک کی رہنمائی میں کام کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ابتدا، ارتقا، نقطۂ عروج اور اختتام کے بغیر کسی صنف کی تخلیق نہیں ہوتی۔ لیکن یہ تمام عناصر ضمنی ہیں۔ ان پر میکانکی طور پر عمل نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں صرف افسانے کے لیے نہیں ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی افسانہ اختتام سے شروع ہوتا ہے اور کوئی کہانی نقطۂ عروج سے اور کوئی افسانہ ارتقا کی کسی اور منزل سے۔ کسی افسانے کا اختتام ہی نہیں ملتا۔ کسی کہانی میں ابتدا کی کوئی اہمیت نہیں۔ کبھی نقطۂ آغاز ہی اختتام ہوتا ہے اور کہانی جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ عضوی ارتقا یعنی آرگن ڈولوپ منٹ کے لیے واقعہ پلاٹ کے مطابق تکنیک کے عناصر ترکیبی پر غور کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی ترتیب ہوتی ہے۔ اس کا بھی تدریجی ارتقا ہوتا ہے۔ ربط اور تسلسل، تنظیم اور اٹھان تنوع اور وسعت سے اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انتشار پیدا ہوگا لیکن اس عمل میں کوئی انتشار نہیں ہوگا۔ اگر مواد کے پیش نظر تکنیک کی تمام نزاکتوں پر غور کیا گیا ہے۔ افسانہ نگاری کا فن ایک مکمل فن ہے۔ اس لیے یہ ایک تعمیر بھی ہے۔ کرشن چندر مہالکشمی کے پل پر ساڑیوں کو زبان دیتے ہیں اختر اورینوی ''کچلیاں اور بال جبریل'' میں تکنیک کو گیلی مٹی سمجھتے ہیں۔ یہ تاثراتی اور ایمائی افسانہ ہے۔ اس میں تکنیک بھی اسی آہنگ کا استعمال ہوا ہے جو واقعہ کا تقاضا ہے۔ حسن عسکری نے ''حرامجادی'' میں تھکے ہوئے دماغ کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ زندگی کے مختلف ٹکڑے ہیں اور ان سے مجموعی تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ دماغ میں الٹی سیدھی باتیں آتی ہیں اسی طرح یہاں بھی ملتی ہیں ایک تھکا ہوا دماغ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کرشن چندر کی کہانی '' آزادی کے دن'' میں بھی مختلف واقعات کے ذریعے اثر آفرینی پیدا کی گئی ہے۔ یہ افسانہ کسی اخبار کا ایک صفحہ نظر آتا ہے جو تراشوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ''ان داتا'' ایک خیالی تصویر ہے۔ قحط بنگال کی یہ سچی تصویر نہیں ہے لیکن یہ بھی تکنیک کا ایک تجربہ ہے۔ ''گرجن کی ایک شام'' اور'' بالکونی'' اردو کے بہترین طویل افسانے ہیں۔ نفسیاتی اور داخلی کیفیت و

اردو افسانہ میں پہلی بار اتنے اچھے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے بنیادی مسائل سے جو فکری اور ذہنی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان کی نفسیاتی تشریح کی گئی ہے۔ یہ اس تکنیک کے بہت ہی کامیاب افسانے ہیں۔ اردو افسانہ میں کرشن چندر سے زیادہ ٹیکنیکل تجربے نہیں کیے گئے ہیں ''پرانے خدا''، ''ٹوٹے ہوئے تارے'' اور ''ہوائی قلعے'' کے افسانوں میں نئے تجربے ملتے ہیں، مغربی طرز کا بھی گہرا اثر ہے۔ چیخوف کی تلخی اور اس کے طنز کو کرشن چندر نے موجودہ زندگی کے لیے جس طرح استعمال کیا ہے۔ اس کا بھی اثر ان کے افسانوں کی تکنیک پر گہرا ہے۔ ''ان داتا''، ''پہلی اڑان'' اور ''پرانے خدا'' بھی نئے تجربے ہیں۔ ان کی تکنیک پر چیخوف کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ عصمت چغتائی اور قدرت اللہ شہاب نے مکالموں کے ذریعے افسانوں کی تعمیر کی ہے۔ یہ طریقہ بھی بالکل نیا ہے۔ شہاب کا ''یا خدا (جو ڈرامے کے فن سے اتنا قریب ہے کہ کچھ لوگ اسے ڈراما ہی کہتے ہیں) بھی ایک نیا تجربہ تھا جو بہت کامیاب ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بھی تجربے کئے ہیں لیکن ان کے تجربے زیادہ ناکام ہیں۔ مونتاج کے فن کو بھی استعمال کیا ہے۔ مختلف ٹکڑوں سے مجموعی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''مونتاج'' افسانے کی قسم نہیں بلکہ ایک فلمی اصطلاح ہے۔ ایک خاص تاثر کے لیے فلمی ٹکڑوں کی خاص ترتیب کو مونتاج کہتے ہیں۔ مونتاج ایک فن اسلوب ہے اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، حسن عسکری، انور عظیم اور خلیل احمد کے یہاں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

☆☆

منٹو کا فن — تنقیدی جائزہ

سعادت حسن منٹو نے جنسیات کے مسئلے پر جس حقیقت پسندانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے اردو ادب میں شاید دوسری زبانوں میں بھی اس کی مثالیں شاید ہی ملیں گی۔ اس کے افسانوں کے اندر پنہاں کرب اس بات کا شاہد ہے کہ وہ عورت کی عزت، عصمت اور گھریلو پن کا جس قدر قائل ہے کوئی دوسرا مشکل سے ہوگا۔ اس لیے جب اس کی عزت کو آنچ آتی ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے اور بے تاب ہو کر جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور جب وہ ہر بار اپنے مشاہدے کو بروئے کار لا کر ایک ہی تسلسل کو، ایک ہی ترتیب کو اور سماج کے ایک ہی نظام کو دیکھتا ہے تو غصے میں آ کر اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے۔ وہ ڈرانے اور تھپڑ مارنے کا قائل ہے۔ اس کے ہر افسانے کے آخر میں ایک طمانچہ ہوتا ہے جو پڑھنے والے کے منھ پر اس بری طرح پڑتا ہے کہ قارئین بھنا کے رہ جاتا ہے اور صلواتیں سنانے لگتا ہے لیکن منٹو اس طمانچے سے باز نہیں آتے جسے بہت سے نقاد منٹو کی اذیت پسندی کہتے ہیں۔ وہ اس کی اذیت پسندی اس قدر نہیں ہے بلکہ اس کی زخمی انسانیت کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے اور یہی چیز ہمیں منٹو کے اطوار و گفتار اس کی تخلیقات، اسی کے قول و فعل میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کے جوہر کا غالب حصہ انسانی حسن، انسانی ہمدردی اور انسانیت کو بہتر بنانے کی آرزو کی غمازی کرتا ہے اور یہی اس کے ادب کے گہرے نقوش ہیں۔

منٹو نے ہمیشہ اپنے افسانوں کے لیے سرخی کا انتخاب ایسا کیا ہے کہ سرخی دیکھنے سے ہی ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ منٹو کیا کہنا چاہتا ہے۔ کبھی تو وہ اپنے افسانوں کی سرخی کسی خاص کردار کے نام پر رکھتا ہے جس کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ موذیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، بابو گوپی

ناتھ وغیرہ۔ منٹو کے افسانے میں جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اسے ہی منٹو اپنے افسانوں میں بطور سرخی استعمال کرتا ہے۔ جیسے ''بو''، ''دھواں''، ''ہتک''، ''کالی شلوار''، ''پھاہا''، ''شوشو''، ''بانجھ'' وغیرہ۔ سرخی دیکھنے سے ہی قاری یہ اندازہ لگالیتا ہے کہ منٹو اپنے افسانے میں کیا کہنا چاہتا ہے اور اس کا پورا پس منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کا موضوع ہر وہ چیز ہوسکتی ہے جس میں کوئی نیا پن اور کوئی تیکھا پن ہو۔ منٹو کا اپنا ایک منفرد انداز ہے، منٹو کا اپنا ایک الگ رنگ ہے۔ منٹو حقیقت نگار ہے لیکن اس کی حقیقت پیشگی میں نہ تو پریم چند کا ''گاندھی پن'' ہے اور نہ کرشن چندر کا ''لینن پن''۔ بقول ڈاکٹر اختر اورینوی—

> ''منٹو کسی کی عینک سے دنیا کو دیکھنے کا عادی نہیں۔ وہ کسی ٹھپے کو برداشت کر ہی نہیں سکتا۔[1]''

کلرک، مزدور، طوائف، رند خرابات اور زاہد پاک، کشمیر، بمبئی، دہلی، لاہور، فلم اسٹوڈیو، کالج، بازار، گھر، ہوٹل، چائے خانے، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد اور ان سب کی ذہنی الجھنیں اور ان ساری چیزوں سے بڑھ کر جنس اور اس کے گوناگوں مظاہرے منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان موضوعات میں سے بعض منٹو کو بہت عزیز ہیں۔ بعض کوچوں میں پہنچ کر اس پر جو سرشاری طاری ہوتی ہے وہ دوسری جگہوں پر نظر نہیں آتی۔ ذکر کسی کوچے کا ہو، کسی شخص کا ہو اور کسی بات کا ہو یہ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ منٹو اس کوچے کے سارے پیچ وخم، اس شخص کے دل کے سارے بھید اور اس بات کی ساری نزاکتوں اور لطافتوں سے واقف نہیں۔

منٹو کا تصور کیا تھا اسے چند اقتباسات کے ذریعے سمجھایا جاسکتا ہے۔

منٹو نے ایک خط میں احمد ندیم قاسمی کو لکھا تھا کہ—

''زندگی کو اس شکل میں پیش کرنا چاہیے، جیسی کہ وہ ہے، نہ کہ وہ جیسی تھی، یا جیسے ہوگی یا جیسے ہونی چاہیے۔''

منٹو اپنے افسانے ''ممی'' میں لکھتا ہے—

---

[1] کسوٹی—اختر اورینوی ص ۸۶

> ''میں نے سوچا عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکش پہلو بھی ہے۔''

منٹو اپنے ایک کردار نیلم سے مندرجہ ذیل فقرے کہلواتا ہے:

> ''—بادلوں میں گھرے ہوئے لوگ کیا صرف آسمان کی خواہش نہیں کرتے۔ برف کے تودوں میں دبی ہوئی چیزیں کیا سورج کی تپش کے لیے نہیں تڑپتیں۔ زمین پر رہنے والے کیا تاروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ کیا فرشتوں نے آسمان چھوڑ کر زمین پر آنے کی غلطی نہیں کی۔ شعروں کے نرم و نازک بستر سے نکل کر حقیقت کے پتھروں پر چلنے کی خواہش دلمیں پیدا نہیں ہوسکتی۔''[1]

منٹو زندگی اور اس کے مسائل کو مختلف اوقات میں مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اور جو کچھ سوچتا ہے، اسے بغیر کسی جھجک، خوف اور اندیشے کے جرات کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔

منٹو کی نظر میں بڑی گہرائی ہے۔ سیاست، معاشرت، دین، اخلاق معاشرہ اور فرد ان سب پر اس کی گہری نظر ہے۔ اس کی باریک بیں اور نکتہ رس نگاہ ہر ایک کے حسن و قبح، اچھائی برائی اور عیب و ہنر کو اس طرح دیکھتی ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کوئی حقیقت اس سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ اس طرح عیب و ہنر پوری طرح احاطہ کر لینے کے بعد وہ ان میں سے ہر ایک کا اس نظر سے تجزیہ کرتا ہے کہ ان میں سے کون سی چیزیں فرد اور جماعت کو دھوکے میں رکھتی ہیں، کن سے انسانی زندگی عذاب میں مبتلا ہے اور کن سے انسانی زندگی اس سکون و مسرت سے محروم ہوئی ہے جو فطرت کا مقصود ہے۔ منٹو انسانی زندگی کو اس کے اجتماعی اداروں یعنی سیاست، معاشیات، دین اور اخلاق میں فطرت کے بتائے ہوئے

---

[1] دھواں۔

راستے پر اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق پوری طرح پروان چڑھتے دیکھنا چاہتا ہے اور جب اس پہلو سے زندگی کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ انسان نے انسان کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے اور ایک ایسے انداز سے کی ہے کہ ناانصافی کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔

منٹو بہت ہی ذکی حس واقع ہوا تھا۔ وہ کسی بات کو بہت ہی شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ اس کے جذبات میں احساس کا غلبہ تھا۔ اس کی جواب دہی سراسر منٹو کے ماحول پر عائد ہوتی ہے۔ بچپن ہی سے باپ کی بے رخی، بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی کا وہ نشانہ بنا رہتا تھا۔ منٹو کے احساسات میں ہمیشہ سے ایک دبی دبی سی چنگاری نے شعلہ کی شکل اختیار کر لی۔

سعادت حسن منٹو اپنے بارے میں کہتا ہے:

> ''میری زندگی ایک دیوار ہے، جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں، کبھی یہ جی میں آتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔''

منٹو اس یقین اور بے یقینی کے دوراہے میں زندگی اور اونی جراب کے ادھیڑنے کی تمثیل کو بہت پسند کرتا ہے۔ پہلے دیے ہوئے حوالے کے ساتھ مندرجہ ذیل تحریر ملاحظہ ہو —

> — ''کسی نہ کسی طرح ہمیں اس اونی جراب کے دھاگے کا سرا پکڑ کر اسے ادھیڑتے جانا ہے اور بس۔[۱]''

منٹو نے موجود، سماجی نظام کے اندر بسنے والی طوائف کی زندگی کے چھلکے اتار کر الگ کر دیے ہیں اس طرح کہ اس افسانے میں نہ صرف طوائف کا جسم بلکہ اس کی روح بھی ننگی نظر آتی ہے۔ ایک شیشے کی طرح ہم اس کے آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ کس بے دردی

---

[۱] منٹو کی چند یادیں اور چند خطوط۔ احمد ندیم قاسمی

اور سفاکی سے منٹو نے اسے ننگا کر دیا ہے لیکن اس بدصورت خاکے کا ہر رنگ بدصورت ہوتے ہوئے بھی ایک نئے حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ طوائف سے محبت نہیں ہوتی۔ سوگندھی اور اس کی زندگی پر رحم بھی نہیں آتا لیکن سوگندھی کی معصومیت اور اس کے عورت پن پر اور اس کی زندگی اور اس کی تخلیق پر اعتقاد ہو جاتا ہے اور یہی سچے اور لافانی ادب کا جوہر عظیم ہے۔

سعادت حسن منٹو کا مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کو جس شکل اور جس حالت میں دیکھتا ہے ویسا ہی پیش کر دیتا ہے۔ منٹو کے ہاتھ میں ایک فوٹو کیمرہ ہے جہاں پر اسے موقع ملتا ہے وہ کیمرے کا کلک دبا دیتا ہے اور فوٹو کھینچ کر قاری کے سامنے کر دیتا ہے اور لوگ زندگی کی صحیح اور سچی تصویر دیکھ کر تلملا اٹھتے ہیں۔ منٹو کہتا ہے—

> —"جب تک انسانوں میں اور خاص کر سعادت حسن منٹو میں کمزوریاں موجود ہیں وہ خوردبین سے دیکھ دیکھ کر انسان کی کمزوریوں کو باہر نکالتا اور دوسروں کو دکھاتا رہے گا لوگ کہتے ہیں کہ یہ سراسر بیہودگی ہے۔ تم جو کچھ لکھتے ہو خرافات ہے— میں کہتا ہوں بالکل درست ہے۔ اس لیے کہ میں بیہودگیوں اور خرافات ہی کے متعلق کہتا ہوں[1]"

منٹو بعض خصوصیات کے باعث سب سے الگ تھلگ ہے۔ اس نے افسانے کو حقیقت اور زندگی کے بالکل قریب کر دیا اور اسے خاص پہلوؤں اور زاویوں کے ساتھ عوام تک پہنچا دیا۔ عوام ہی کو کردار بنائے اور عوام ہی کے انداز میں عوام کی باتیں کیں۔ اس نے کرداروں کے ساتھ واقعات کو اس خوبصورتی سے آگے بڑھایا کہ واقعات کو قاری کے دماغ پر شروع سے آخر تک چھپائے رکھتا ہے۔ وہ شروع ہی سے قاری کے ذہن پر ایک گہرا نقش بٹھائے رکھتا ہے۔ یہ ڈھنگ اس کا اپنا ڈھنگ ہے۔ یہ اس کی اپنی قلمرو ہے اور وہ اس میں کسی کو شریک نہیں ہونے دیتا۔ اس کے افسانوں کی تمہیدوں سے پڑھنے والے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ افسانے کے چنگل سے آخر تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ خود کو مجبور پاتے ہیں۔ یہی افسانہ نگاری کی سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔

---

[1] لذت سنگ — سعادت حسن منٹو ص ۱۸۔

''نیا قانون'' کی تمہید ملاحظہ ہو—

> —''منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہ دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ استاد منگو کی واقفیت سے اچھی طرح واقف تھے۔''

اور ''بلاؤز'' کی تمہید اس طرح سے ہے—

> ''کچھ دنوں سے مومن بے قرار تھا اس کا وجود کچا پھوڑا بن گیا تھا، کام کرتے وقت باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ سوچنے پر بھی اسے ایک قسم کا درد محسوس ہوتا تھا۔ ایسا درد جس کو وہ بیان بھی کرنا چاہتا تو بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

ان دو تمہیدوں میں منٹو ہمیں دو مختلف کرداروں سے متعارف کراتا ہے جن کے جاننے کے لیے ہم بے تاب ہو جاتے ہیں اور ہمارے دل و دماغ میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو جاتی ہے جو ہمیں سارے افسانے کو پڑھنے پر اکساتا ہے۔

''پھاہا'' کی تمہید صرف ایک جملہ ہے—

> ''گوپال کی ران پر جب بڑا پھوڑا نکل آیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔''

یہ پڑھتے ہی قاری کچھ گھبرا سا جاتا ہے اور خود سے یہ سوال کرتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا ہو گا؟ اور کیا ہو سکتا ہے؟ وہ افسانہ شروع کر دیتا اور ختم کر کے ہی سانس لیتا ہے۔

''پہچان'' کی تمہید—

> ''ایک نہایت ہی تھرڈ کلاس ہوٹل میں دیسی وہسکی کی بوتل ختم کرنے بعد طے ہوا کہ باہر گھوما جائے اور ایک ایسی عورت کی تلاش کی جائے جو ہوٹل اور وہسکی کے پیدا کردہ تکدر کو دور کر سکے۔''

اس میں کسی کردار سے تعارف نہیں ہوتا ہے اور نہ کوئی فضا یا ماحول بنانے یا پیدا کرنے

کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ کوئی چونکا دینے والی خبر سنائی گئی ہے۔ بلکہ بہت ہی واضح اشارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس میں آنکھ کے اشارے سے قاری کو ایک دعوت دی گئی ہے کہ اگر تم بھی آنا چاہتے ہو تو آؤ اور قاری فوراً یہ دعوت قبول کر لیتا ہے——

> ''اسے یوں محسوس ہوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتویں منزل اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔''

یہ ''نعرہ'' کی تمہید ہے۔ اس میں افسانہ کے مرکزی کردار کیشو لال کی ذہنی کیفیت کا نقش قاری کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اور شاید افسانہ نگار اپنی کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ اس لیے کہ کیشو لال کے اس شدید احساس کہ پیچھے کیا واقعہ کام کر رہا ہے، اس کے دل میں یہ جاننے کی خلش پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح افسانہ نگار کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔

> ''دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی میونسپل کمیٹی کا داروغہ حنائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا خیال تھا جو اسے بے حد پریم کرتی تھی۔''

یہ تمہید ''ہتک'' کی ہے۔ اس میں افسانہ نگار نے کئی باتیں کہی ہیں۔ ایک تیر سے کئی شکار کیے ہیں۔ اس لیے کہ افسانہ میں آگے چل کر جو گھمسان شروع ہونے والا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ بات بجائے سیدھے سادے انداز میں کہنے کے ذرا گھما پھرا کر کہی جائے۔ قاری افسانہ نگار کے تیور پہچان جاتا ہے اور وہ یہ سوچ کر افسانہ کے منجدھار میں کود پڑتا ہے کہ دیکھیں یہ تھک کر سو جانے والی اور اپنی بیوی کا محبوب داروغہ حنائی آگے چل کر کیا گل کھلاتے ہیں۔

جس طرح تمہید سے قاری پورے حالات جاننے کے لیے بیقرار ہو جاتا ہے اور افسانہ کے انجام سے اطمینان پاتا ہے اور کوئی بات مبہم یا غیر واضح نہیں رہ جاتی، خاتمہ ہی سے ہمیں منٹو کے فن کا احساس ہوتا ہے کیونکہ وہ افسانے کے درمیان یا خاتمے کے دوران سے پہلے یہ محسوس نہیں ہونے دیتا کہ افسانہ کس مقام پر ہے وہ کچھ ایسی خوبی سے پروئے جاتا

ہے کہ واقعات کی لڑی ایک خوبصورت ہار بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ پھر جو جوہری دیکھتا ہے وہ اس کے بہت ہی زیادہ قیمتی ہونے پر حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔ منٹو اپنے افسانوں کی تکمیل میں فن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور قاری کے لیے بہت سا غور و فکر کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔ اب قاری جتنا سوچتا ہے، منٹو کے فن کا متعارف ہوتا جاتا ہے اور اس کا اور اس کے افسانے کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ چند افسانوں کے انجام یہ ہیں۔ ''نیا قانون'' یوں ختم ہوتا ہے۔

''استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون، نیا قانون چلاّتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی پرانا ہے۔''

> اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ''پھاہا'' یہ انجام لئے ہوئے ہے—
>
> ''نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھی۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا مرہم نکال کر اس پر پھیلا دیا، اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نلکی پر صابن کا چھوٹا سا نامکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے۔ نرملا نے پھاہا پر پھونک ماری اور ننھے سے ابھار پر جما دیا۔''
>
> ''ہتک'' کی سوگندھی ہم سے اس طرح رخصت ہوتی ہے—
>
> ''بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی، سوچ بچار کے بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔''

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے۔ ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو، ایک فنکار کی حیثیت

سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ انھیں اپنے افسانوں میں کوئی ایک بات ہے اور اس طرح پڑھنے والے کے ذہن پر ایک خاص تاثر قائم کرنا ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے افسانے اور بڑے سے بڑے افسانے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے بہت سی چیزیں آتی ہیں یعنی منٹو کا ہمہ گیر مشاہدہ جس ماحول پر اپنی نظر ڈالتا ہے اس کے باریک سے باریک پہلو کو نظر میں رکھ کر اسے اپنے افسانے کا پس منظر بناتا ہے۔ واقعہ اور کردار کے ذکر میں منٹو بہت کم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واقعہ یا کردار کی پوری تفصیلات پر عبور حاصل کیے بغیر اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کریں لیکن مخصوص ماحول یا کردار کے ہر پہلو اور اس کی ہر فروعی اور جزوی کیفیت سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد بھی وہ اس ماحول یا کردار کی مصوری کو اپنی افسانہ نگاری کا مقصد نہیں بناتے۔ یہ سارا علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے پس منظر یا وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس پس منظر کے پیچھے کوئی ایک تاثر، جذبہ، ذہن اور کیفیت موجود ہوتی ہے جسے سامع یا ناظر کے ذہن تک پہنچانا افسانہ نگار کا مقصود ہے۔ مثلاً ان کے افسانے ”نیا قانون“، ”خوشیا“، ”نعرہ“، اور ”نیا سال“ پڑھ کر قاری افسانہ نگار کے مشاہدے، اس کے تخیل، فکر اور تجزیہ حیات کی بدولت بے شمار چیزوں کا عکس اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے لیکن ان بیشمار چیز کا مشاہدہ مجموعی طور پر اس کے ذہن میں ایک خاص کردار کی ذہنی کیفیت کا نقش بٹھاتا ہے۔

منٹو نے اپنے منصب کو برابر یاد رکھا ہے کہ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ افسانہ نگاری کے اس بنیادی اصول سے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد قاری کے ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہئے لیکن یہ واحد تاثر پیدا کرنے اور اسے قائم کرنے کے لیے اسے مختلف فنی وسیلے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ فنی وسیلے اگر پوری ذمے داری اور پورے فنی احساس اور خلوص کے ساتھ کام میں لانے پڑتے ہیں۔ اگر یہ کام میں نہ لائے جائیں تو مجموعی تاثر کا حصول بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور کہانی کی اسی وحدت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کی بنیادی اور امتیاز خصوصیت ہے۔

اچھی کہانی کی خصوصیت جہاں ایک طرف یہ ہے کہ وہ ختم ہو چکے تو قاری کے ذہن کو تاثرات کے انتشار میں مبتلا نہ کر دے، دوسری اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ لکھنے والے نے کہانی کے مختلف حصوں میں آہستہ آہستہ ایسی فضا بنائی ہو کہ قاری کا ذہن اس مجموعی تاثر کو بڑے فطری انداز میں قبول کرے۔ فضا بنانے اور ذہن کو ایک خاص تاثر قبول کرنے پر آمادہ کرنے کا مشکل کام یوں تو پوری کہانی میں جاری رہتا ہے لیکن اس کا نقطۂ آغاز افسانے کے وہ ابتدائی الفاظ یا جملے ہیں۔ جنھیں ہم افسانے کی تمہید کہتے ہیں۔ افسانے کی تمہید افسانوی فن کی بڑی اہم بڑی دشوار اور افسانہ نگار کے نقطۂ نظر سے، بڑے کام کی منزل ہے۔ قاری کے ذہن پر پوری طرح چھایا جائے گا جو نصب العین افسانہ نگار کے سامنے ہے وہ مناسب اور موزوں تمہید کے ذریعے آدھا بلکہ بعض اوقات آدھے سے بھی زیادہ اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ منٹو ایک دیانت دار اور مخلص فنکار کی طرح ہمیشہ اپنی جیت اسی میں سمجھتا ہے کہ وہ موضوع اور تمہید سے شروع ہی سے قاری کے ذہن پر چھا جائے۔ منٹو نے اچھے اور برے جتنے افسانے لکھے ہیں ان کے موضوع اور خیال سے پڑھنے والا خواہ متفق ہو یا نہ ہو لیکن افسانہ کی تمہید میں اسے ضرور ایک دلکشی محسوس ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

آغاز سے انجام تک ایک دنیا ہوتی ہے۔ افسانہ نگار کی خود پیدا کردہ دنیا جس کی وہ قاری کو سیر کراتا ہے اور اس کے افراد سے روشناس کراتا ہے، ان کے اچھے اور برے پہلو اجاگر کرتا ہے، اس کے جلوؤں اور سایوں میں لیے پھرتا ہے، کہیں کردار کو متحرک کر دیتا ہے اور کہیں حالات و واقعات کا شکار بنا ہوا محسوس کراتا ہے، اس میں منٹو سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ وہ قاری کو کردار کے ساتھ ساتھ اٹھاتا، بٹھاتا، دوڑاتا، بھگاتا ہے اور آخر میں مطمئن چھوڑ جاتا ہے، لیکن خالی الذہن نہیں، سبک دماغ نہیں، گراں دل نہیں۔

منٹو کا اپنا رنگ ہے۔ اس کی اپنی انفرادیت ہے۔ وہ اس کامیابی کے ساتھ جزئیات پیش کرتا ہے کہ ہر چیز کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ اسلوب میں تشبیہوں میں استعاروں میں اور الفاظ کے انتخاب میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ اسی لئے ایک

خاص قسم کی شوخی اور تیکھا پن ہوتا ہے اس کی جزئیات میں اور اس کے بیان میں۔ چند مثالیں — بازار حسن کی عورتوں کے متعلق کہا گیا ہے —

> ”یہ رنگ برنگ کی عورتیں مکان میں پکے ہوئے پھلوں کی طرح لٹکتی
> رہتی ہیں، میں آپ ڈھیلے مار کر انھیں گرا سکتے ہیں۔[۱]“

”وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔[۲]

یہی نہیں بلکہ اس کے بیان میں ایک کشش ہے جو پڑھنے والے کو اور زیادہ گرفت میں لیے جاتا ہے اور آخر تک دل و دماغ باندھے رکھتا ہے —

ایک جگہ لکھتا ہے —

> ”رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور
> مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔[۳]“

کچھ لوگ منٹو کے افسانوں میں اچھے اور برے بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو اس کے وہ افسانے جو ہمیں برے معلوم ہوتے ہیں، برے نہیں۔ ان میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہے۔ جو عام نظروں سے پنہاں ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے ایک سطحی دل و دماغ کی نہیں بلکہ امور شناس آدمی ہونا چاہیے۔ اس کے کرداروں میں طوائف، رند خرابات، زاہد پاکباز اور اس کے مقامات میں کالج، بازار، ہوٹل کے علاوہ بہت کچھ شامل ہے۔ ان کے ساتھ ہی ان کی ذہنی الجھنیں، ان کا ماحول اور ان کا نفسیاتی حیثیت سے تجزیہ ہے۔

---

[۱] پہچان

[۲] ہتک

[۳] بابو گوپی ناتھ

حیات انسانی کے سب ہی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ زندگی کی خرابیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ سماج کے ناسوروں کا آپریشن کیا ہے۔ اس کی یہی حقیقت نگاری کم نظر والوں کو عریاں نظر آتی ہے اور اسے فحش افسانہ نگار کہا جاتا ہے کچھ لوگوں نے اسے نہ جانے کیا کیا کہا کچھ لوگوں نے گالیاں دیں، مگر وہ ذرا نہیں گھبرایا اور اپنے راستے پر ڈٹا رہا۔

طوائفوں اور پست اخلاق عورتوں کے نفسیاتی مطالعے پر اس نے بہت توجہ دی۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اس کی زندگی کچھ ایسے ہی ماحول میں گزری ہو۔ اس کی نشتر دار نظریں وہ سب کچھ دیکھتی ہیں جہاں تک ہماری نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔ اس نے ان کی مجبوریوں کو محسوس کیا ان کے دکھ درد کو جانا، ان کے بے بسی اور لاچاری کو سمجھا اور ان کے سینے میں دلوں کی دھڑکنیں سنیں، ان کے سسکتے اور دم توڑتے ہوئے ارمانوں کو بھی دیکھا ان تمام جزئیات نے منٹو کی شخصیت کو نہایت تہہ دار بنا دیا اور اس نے تمام موضوعات پر قلم اٹھا کر ان تمام حقیقتوں کا انکشاف کیا جو کہ طوائفوں سے ہمدردی اور غلط نظام سے نفرت کا احساس پیدا کیا ہے۔

''ہتک'' میں سوگندھی کی کہانی ہے۔ وہ سوگندھی جو ایک طوائف بھی ہے اور ایک عورت بھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جو ایک طوائف کم اور عورت زیادہ ہے اور اس ذلیل پیشے کو خیر باد کہہ کر عورت بنا چاہتی ہے۔ اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہے لیکن یہ ایک ایسی دلدل ہے کہ اس سے باہر نکل نہیں سکتی اور جتنی جدوجہد کرتی ہے اتنی ہی دھنستی چلی جاتی ہے اور آخر تک وہ ایک طوائف ہے رہتی ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس کی قیمت صرف دس روپے تھی۔ اس میں ڈھائی روپئے اسے رام لال کو دینے پڑتے تھے۔

اس میں طوائفوں کی تمام خصوصیات موجود تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک جذباتی عورت بھی تھی اور یہ جانتے ہوئے کہ اسے مردوں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرنا ہے وہ نہ کر سکتی تھی۔ جب بھی اس کا کوئی نیا یا پرانا ملاقاتی اس کے پاس آتا اور بڑے پریم سے کہتا——

''سوگندھی میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔''

تو سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس

کرتی تھی کہ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔

لیکن یہ مرد اس کے نہ ہو سکے، انھوں نے سوگندھی کو ایک طوائف ہی سمجھا، ایک زمانے میں مادھو کی باتیں اسے بڑے اچھی لگتی تھیں اور اس کی باتوں سے وہ بہت متاثر رہتی تھی۔ مادھو ہر مہینے پونا سے آتا اور اس کو میٹھے میٹھے سپنے دکھاتا لیکن کبھی وہ سوگندھی کے کام نہ آیا اس سے وہ کچھ نہ کچھ لے مرتا تھا اور وہ اسے دے دیتی تھی۔ ایک دن مادھو نے سوگندھی سے پچاس روپئے طلب کیے اس بہانے سے کہ اس پر کوئی ایسا کیس ہو گیا ہے اور یہ رقم اسے داروغہ کو دینی ہے۔ اس وقت سوگندھی کا روبار مندا جا رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک سیٹھ اس کے پاس آیا تھا اور ٹارچ کی روشنی میں اس کے چہرے کو دیکھ کر اسے ناپسند کر کے رخصت ہو گیا تھا، گویا اس نے سوگندھی کی ''ہتک'' کی تھی۔ اس واقع سے سوگندھی کا سارا وجود تھرا اٹھا تھا، وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بھی نہ کر سکتی تھی، خیالات گرم گرم لاوے کی طرح اس کے دماغ سے پگھل کر بہے جا رہے تھے اور وہ خود بھی ان کے ساتھ بہے جا رہی تھی، چنانچہ جب مادھو نے پچاس روپئے کا سوال کیا تو اسے کچھ اس بات کا احساس ہوا کہ مادھو اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اسے کھری کھری سنائی اور خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد، سوگندھی نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے پلنگ پر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

منٹو نے اس کہانی میں طوائفوں کی زندگی کے متعلق جو عکاسی کی ہے وہ بالکل حقیقی ہے۔ طوائف بے شک طوائف ہوتی ہے لیکن وہ ایک عورت ہے، ایسی عورت جو عورت ہوتے ہوئے بھی عورت نہیں ہے۔ وہ عورت بننا چاہتی ہے لیکن بن نہیں سکتی ہے وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہے جو اسے کرنا چاہیے لیکن کر نہیں سکتی اور اسے وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جو وہ نہیں چاہتی ہے کیوں کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔ حالات اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں اس سے بڑی حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کہانی میں سوگندھی کی زندگی، اس کے جذبات، رام لال سے اس کے تعلقات، اپنی ہم پیشہ سہیلیوں سے اس کی ہمدردی اور

مشورے، سیٹھ سے ہونے والی اس کی ہتک، مادھو اور دوسرے تین آدمیوں کے بارے میں اس کی غلط فہمی اور حقیقت کو جاننے کے بعد مادھو سے سخت کلامی، ان تمام باتوں میں ہمیں حقیقت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہی حقیقت نگاری اس کے ہر افسانے میں جاری و ساری ہے۔ یہ جھلکیاں ہمیں اس کے افسانوں میں مختلف انداز میں ملتی ہیں۔ گو یہ انداز مختلف ہے لیکن بنیادی حیثیت ایک ہی ہے۔

''خوشیا'' بھی ''ہتک'' کی طرح ایک طوائف کی کہانی ہے جو پیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا۔ ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کو اس کی کھولی میں ننگا دیکھا۔ کانتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور یہ کہہ کر اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی—

''جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا۔

کیا ہرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ آنے دو''!

اور وہ خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی کسی عورت کو یوں ننگا نہ دیکھا تھا، کانتا کو ننگا دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا، لیکن اس گھبراہٹ میں بھی اس نے ایک عجیب سی لذت محسوس کی، آخر کار دلاّل سے گاہک بن گیا، اور ایک دلاّل کے ساتھ کانتا کے گھر ٹیکسی میں پہنچا۔ دلال معاملہ طے کر کے کانتا کو ٹیکسی میں لے آیا اور جب کانتا ٹیکسی میں داخل ہوئی تو خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور کہا اس نے—

''خوشیا!! تم۔'' خوشیا نے جواب دیا'' ہاں میں! لیکن تمہیں روپے مل گئے نا؟''

''خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی— ''دیکھو! ڈرائیور!! جو ہو لے چلو''—

اس واقعے کے بعد خوشیا بازار میں نہیں آیا۔

اس افسانے میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ مرد بھی آخر مرد ہوتا ہے۔ چاہے وہ دلالی ہی کیوں نہ کرتا ہو، وہ خوشیا جو دس سال سے دلالی کر رہا تھا اور جس کے جذبات تقریباً سرد پڑ چکے تھے، آخر کار جاگ اٹھا اور اس نے دلال کے ذلیل پیشہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا، ان بنیادی حقیقتوں سے کون منکر ہو سکتا ہے۔ ان حقیقتوں کو اجاگر

کرتے وقت منٹو نے نفسیاتی نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھا ہے جس میں انسانی جنسی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ جس کا اس نے اس ڈھنگ سے تجزیہ کیا ہے کہ انسانی کیفیت کے بہت سے اسرار و رموز کی حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ''شوشو''، ''پھاہا''، ''بلاوز''، ''بو''، ''دھواں'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' وغیرہ اس قسم کی جنسی حقیقتوں کے متعلق افسانے ہیں۔

سعادت حسن منٹو زندگی کو اس نے جس نگاہ سے دیکھا اور جس جس روپ میں دیکھا اسے بے کم و کاست اپنے افسانوں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اس کی ایک منفرد خصوصیت تھی۔ شاید اسی لیے حسن عسکری نے لکھا ہے کہ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔

منٹو یوں تو ایک فطری افسانہ نگار ہے لیکن اپنی چند تحریروں میں وہ باشعور فنکار نظر آتا ہے۔ وہ موضوع کے انتخاب میں اتنا شدت پسند ہونے کے باوجود موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجہ کا پختہ کار اور متوازن فنکار بن جاتا ہے۔ مختصر افسانہ کی تکنیک پورے خلوص، دیانت داری، احتیاط اور فنی تکمیل کے ساتھ برتنے میں اردو افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا حریف نہیں۔ یہی فن ہے جو منٹو افسانہ نگار کو ایک انفرادی حیثیت اور عظمت عطا کرتا ہے۔ ہم چاہے منٹو کی شخصیت یا اس کی افسانہ نگاری کے خواہ کسی پہلو پر لکھیں یا سوچیں اس کے فن کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ اس فن کے باعث وہ پہچانا جاتا ہے۔

میرا مطلب اس سے ہرگز یہ نہیں ہے کہ منٹو کی افسانہ نگاری میں ان موضوعات یا اس نقطۂ نظر کی اہمیت نہیں ہے جو ان موضوعات کے انتخاب کی ذمے دار ہے۔ کسی بھی ادیب کے نقطۂ نظر کو معلوم کیے بغیر اس کے فن کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ لیکن میں فن جن معنوں میں استعمال کر رہی ہوں اس کا مطلب ادبی اور فنی روایات کے اس تسلسل سے ہے جس سے ہم ایک صنف ادب کو دوسرے سے الگ کر سکتے ہیں۔ تکنیک کی ان مبادیات اور مطالبات ان اصول و قوانین سے ہیں جو ایک صنف ادب اور دوسری صنف میں مابہ الامتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ داستان، ناول، ڈراما اور افسانہ بنیادی طور پر علاحدہ اور مختلف بھی ہیں۔ یہی حد فاصل جو داستان کو ناول سے، ناول کو ڈرامے سے اور ڈرامے کو افسانے سے

الگ کرتی ہے۔ فن کی وہ نازک لکیر ہے۔ جس کا اچھی طرح احترام کیے اور ان قوانین کو اچھی طرح برتے بغیر فنکار اپنے فن سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا۔ دوسری چیز جو فن کا جائزہ لیتے وقت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فنکار نے ان فنی اور ادبی روایات کا لحاظ احترام کرتے ہوئے اپنے خیال اور احساس کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے کیا وسائل اور ذرائع اختیار کیے ہیں۔ ادب میں ہیئت اور موضوع، مواد اور فارم کے درمیان اسی وقت رشتہ مضبوط اور گہرا ہوتا ہے جب اظہار کے لئے مختلف وسائل کے استعمال میں فنکار اپنی تخیل فکر اور ذہنی کاوش کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت کو ادبی اور فنی روایات کے تسلسل کے آئینے میں پوری توجہ، انہماک، خلوص اور دیانت داری کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کرے۔ اپنے فن کے ساتھ وہ جتنا پر خلوص ہوگا اور جس انہماک اور جذبہ وشوق سے اسے اس کے ساتھ اپنے رشتے اور تعلق کا شعوری طور پر علم ہوگا اتنا ہی اظہار اور ابلاغ کے عمدہ سے عمدہ ذرائع اور وسیلے اس کے ہاتھ آتے جائیں گے۔ ایک اچھے فنکار کو حروف اور الفاظ کو شعلوں سے تراشنا پڑتا ہے اور اپنے دماغ اور شعور میں آگہی کا ایک آتشکدہ بھڑکانا پڑتا ہے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے منٹو نے اپنی پوری فنی زندگی میں کبھی بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ اس نے کبھی کسی ایسے موضوع کو نہیں اپنایا جس کے کیف وکم سے وہ پوری طرح واقف نہ ہو۔ منٹو کی عظمت یہی ہے کہ اس نے چاہے جس قسم کے افسانے لکھے ہوں کہیں بھی فن کے اس نازک رشتے سے اس کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک فطری آرٹسٹ ہونے کے باوجود اپنی بہت سی تحریروں میں ایک بڑا باشعور اور متوازن فنکار نظر آتا ہے۔ جسے اپنے افسانے کے ایک ایک لفظ کی صحیح نشست اور ایک جملے کے مناسب استعمال کا علم ہے۔

منٹو کہانی کے انجام میں اپنے اس اشتیاق کی تسکین تلاش کر لیتا ہے جو کہانی کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس میں پیدا ہوتا اور بڑھتا رہا تھا۔ دوسری طرف وہ ان میں سے ہر ایک خاتمہ کو اس منطقی ربط کی آخری کڑی بنا کر جو کہانی کی تمہید سے شروع ہوگی برابر زیادہ منظم بنتا رہا تھا۔ افسانہ کی فنی زنجیر کو مکمل کر لیتا ہے۔ ان میں سے ہر خاتمہ کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔

''پھاہا'' کا انجام واقعہ نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کا بڑا سیدھا سادا اور ایک ایسا غیر متوقع امتزاج ہے جو ایک معمولی سے واقعے کو اس کی نظر میں بڑی اہمیت دے دیتا ہے۔ ''شبہ نشیں پر'' کا انجام جذباتی کھنچاؤ کشمکش اور اس کے بڑے سادہ لیکن فنکارانہ حل کی تصویر ہے۔ ''ہتک'' کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر ایک خاص کردار کے شدید ردِعمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو بظاہر ایک معمولی سے واقعے کے ذکر سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پڑھنے والا سوگندھی کی جذباتی شدت میں اس کا ہم نوا ہو کر ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جو سوگندھی کے کے نزدیک قابلِ نفریں ہے۔ ''نعرہ'' کے آخری چند جملوں میں کہانی کے مرکزی کردار کیشو لال کی جذباتی شدت اور اعصابی کشمکش کو تھوڑے سے لفظوں میں بیان کر کے افسانہ کو جس جملے پر ختم کیا ہے اس کی سادگی فضا کی شدت کو اور بھی نمایاں کر کے زندگی کی ٹریجڈی کو تلخ تر بنا دیتی ہے۔ ''بیگو'' کا انجام منٹو کے فن کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ منٹو اپنے افسانے کے خاتمے پر ایک بظاہر بالکل غیر اہم اور معمولی بات کہہ کر پڑھنے والے کے ذہن کو ایک بار پھر بڑی تیزی سے ان سارے واقعات میں گزار دیتے ہیں جو افسانے میں اس سے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ ''میرا اور ان کا انتقام'' میں آخری جملے میں چھپی ہوئی ہلکی سی ایمائیت کہانی کے دونوں مرکزی کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو آئینہ کی طرح روشن کر دیتی ہے۔ ''نامکمل تحریر'' میں آخری جملے میں بات کہنے کے ایک نئے انداز سے ایک معمولی سے رومانی واقعے کو ایک ناقابلِ فراموش یاد کی حیثیت مل جاتی ہے۔ ''سجدہ'' کا انجام منٹو کی اس منفرد خصوصیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جس میں افسانہ نگار کوئی ایسی بات کہہ کر جس سے پڑھنے والوں میں سے بعض کے تصورات پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، اپنے فن کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔

فن کے نقطۂ نظر سے سب خاتمے افسانے کے مجموعی تاثر کو مکمل کرنے کی خدمت انجام دینے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لیے اسی مسرت کا باعث بنتے ہیں جو ہر فنی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان سب خاتموں میں لکھنے والے کی قدرت بیان اور اس

کے انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔ کبھی محض سادگی بیان سے کبھی تضاد سے، کبھی تکرار سے، کبھی مزاح کی شوخی سے کبھی طنز سے اور کبھی مشاہدہ، فکر اور تخیل کے امتزاج سے وہ اپنے فن کی تکمیل میں مدد لیتا ہے اور پڑھنے والا اگر غور سے دیکھے تو یہ محسوس کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ افسانے کے خاتمے کا یہ انداز پوری طرح سے سوچا سمجھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار نے خاتمے کے وہ چند جملے جن میں چڑھاؤ کے مختلف مرحلے طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ بلکہ شاید یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے کہ تھکن کا شائبہ کبھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ افسانے کے انجام میں وہی تازگی و توانائی یہاں بھی ہے جو اس کے آغاز میں تھی اور یہ نتیجہ ہے افسانہ نگار کی اس فنی توانائی کا جو ہر مرحلہ پر اور ہر منزل میں اس کی ہم عناں و ہم سفر ہے۔

آغاز اور انجام کے درمیان کی ہر چھوٹی بڑی کڑی کو بڑے احتیاط سے اس جگہ جوڑنا پڑتا ہے جو اس کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ کوئی کڑی اگر ذرا بھی جگہ سے بے جگہ ہو جائے تو ساری زنجیر درہم برہم ہو جائے۔ اس کے ابتدائی سرے اور آخری سرے میں جو ہموار ربط ہے اس میں جھٹکے پڑ جائیں اور پڑھنے والے کے لیے اس ربط میں ایک خوشگوار جھنکار کا جو تصور پوشیدہ ہے وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمارے کم افسانہ نگاروں نے کڑیوں کے ربط کی اس جھنکار کے احساس کو اہمیت دی ہے اور جنھوں نے دی ہے انھوں نے ہمیشہ اس کے فنی مطالبات کا پابند رہنا ضروری نہیں سمجھا۔ منٹو کے فن کا یہ اور امتیاز ہے کہ اس نے آغاز اور انجام کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی اہمیت کبھی نہ بھلاتے، ہمیشہ ہر افسانے کی ضرورت کے مطابق اس کے درمیانی حصّوں کی ساخت، ترتیب، رفتار اور اتار چڑھاؤ کو پوری فنی ذمے داری کے ساتھ برتا ہے۔

''نیا قانون'' منٹو کی بڑی مشہور اور بڑی اہم کہانی ہے۔ اس لیے اس میں آغاز میں انجام کے درمیان واقعات کا یہ فنی اتار چڑھاؤ، یہ نازک اونچ نیچ اور ایک شدید قسم کا نقطۂ عروج شاید بعض لوگوں کو یہ سوچنے کی طرف مائل کرے کہ منٹو اس طرح کے مرحلے صرف ایسے افسانوں میں طے کرتا ہے جو موضوع کے لحاظ سے اہم ہیں۔ حالانکہ غور سے

دیکھا جائے تو یہ بات نہیں۔ منٹو فن کے نقطۂ نظر سے اپنے ایک افسانے کا دوسرے افسانے سے امتیاز برتنے کا قائل نہیں۔ فن کے جو مراحل اہم اور ضروری ہیں وہ اس کی ہر کہانی میں یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ پورے ہونے چاہئیں۔

''منتر'' اور ''میرا اور اس کا انتقام'' جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ پڑھنے والا انھیں پڑھ کر محسوس کرے کہ اس نے ایک ہلکی تفریحی چیز پڑھی ہے۔ ان دونوں افسانوں کا مجموعی تاثر کسی طرح کے قاری پر بھی اس تفریحی تاثر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن منٹو نے ان دونوں کی ترتیب میں پورے فنی انہماک سے کام لیا ہے۔ دونوں کے آغاز اور انجام کے درمیان کی منزلیں سب پورے فنی رکھ رکھاؤ کے ساتھ طے ہوئی ہیں۔

''پھاہا''، ''بلاؤز'' اور ''کالی شلوار'' ایسے موضوعات کی کہانیاں ہیں جنھیں منٹو کا محبوب موضوع کہا جا سکتا ہے اور جن محبوب موضوعات کے قریبی تعلق نے منٹو کو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار بنایا۔ ''پھاہا'' اور ''بلاؤز'' میں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے ان بھولے بھالے اور معصوم جنسی احساسات کی مصوری ہے جو شباب کی صبر آزما اور کٹھن منزل میں قدم رکھنے سے پہلے دل میں ابھرتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں افسانوں کو بڑے سیدھے سادے انداز میں ختم کرنے کے علاوہ آغاز اور انجام کو گہری معنویت دینے کے لیے افسانہ نگار نے بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر اہم واقعات کو جوڑ کر ایسی فضا تیار کی ہے جو پوری توجہ اور انہماک کے بغیر ظہور میں نہیں آ سکتی۔ افسانہ نگار کے اس فنی انہماک اور غور و فکر نے دو سیدھے سادے افسانوں کو ایک علمی حیثیت دے دی ہے، لیکن کمال یہ ہے کہ افسانے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو اہم مطالعے ہونے کے باوجود فن کے ان حدود سے باہر نہیں جاتے جہاں سے نکل کر کہانی کہانی نہیں رہتی۔

یہی صورت ''کالی شلوار'' کے ساتھ ہے۔ ''کالی شلوار'' میں طوائف کی زندگی اور اس کے گھناؤنے ماحول سے تعلق رکھنے والی بہت سی چیزیں پڑھنے والے کے سامنے آتی ہیں۔ اسی ماحول میں واقعات میں ایسا اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے اور وہ ایسے پیچ در پیچ مراحل گزرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو ایک خاص طرح کے عمل کی طرف مائل کرتا ہے۔ ''کالی شلوار

طوائفوں کی گندی کہانی ہونے کے باوجود پڑھنے والے کو اس لیے متاثر کرتی ہے کہ اس میں اس ماحول کے دو کرداروں کے ذہنی کیفیتوں کا ایسا تجزیہ ہے جس میں کہانی کی ساری دلکشی موجود ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ افسانہ نگار نے شروع سے آخر تک افسانے میں جتنی چھوٹی بڑی باتوں کو ایک زنجیر میں مربوط کیا ہے ان میں ایسا رشتہ پیدا ہوگیا ہے کہ جو کسی سخت سے سخت حادثہ سے بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کہانی کے مختلف ٹکڑوں میں ایک کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرنا اس کے آغاز اور انجام کو اسی طرح چھوٹی بڑی بہت سی اہم اور غیر اہم باتوں کے ذریعہ آپس میں جوڑنا کہ دونوں آپس میں لازم ملزوم معلوم ہونے لگیں اور دونوں منطقی طور پر یوں شیر و شکر ہو جائیں کہ ایک دوسرے کا سبب اور نتیجہ بن جائیں۔ منٹو کے فن کی یہی خصوصیت ہے جو ان کے ہر افسانے میں یا کم از کم اکثر افسانوں میں موجود نظر آئے گی۔ منٹو نے اپنی اسی خصوصیت کے ذریعے بہت سے پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔

منٹو کے افسانوں کے کردار زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں دلال ہیں، مولوی ہیں استاد ہیں، پہلوان ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں ہیں، قریب قریب ہر معاشرتی طبقے کے افراد منٹو کے افسانوں میں ملیں گے لیکن ظاہر ہے کہ جس معاشرت کو منٹو نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جس کے افراد کم و بیش منٹو کے حمام میں سب ننگے ہیں وہ متوسط الحال طبقہ ہے۔

یہ سارے کردار محض اس کے تخیل کی پیداوار نہیں ہیں۔ اس نے اپنے مطالعے اور مشاہدے سے انھیں اچھے برے افسانوں کی بھیڑ میں سے چھانٹ لیا ہے جس میں ہم سب کھو جاتے ہیں۔ افسانہ نگار کا کام محض مطالعہ اور مشاہدہ نہیں، انتخاب بھی ہے اور منٹو انتخاب کے معاملے میں ایک ہوشیار فنکار ہے۔ اس کے کردار ناٹک کے اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کی طرح اپنے منہ پر نقلی چہرے چڑھائے نظر نہیں آتے بلکہ وہ تو اپنے جسم سے لباس بھی اتار پھینکتے ہیں کہ ہم ان کے خدوخال، ان کے دلآویز خطوط اور ابھار یا پھر رستے ہوئے ناسور اور سڑے ہوئے زخم بھی دیکھ لیں۔ ان کی گفتگو بھی بے تکلف اور برجستہ ہوتی ہے۔ گالی بکنے والا کردار گالی ہی بکتا ہے۔ موقع بہ موقع اقبال کا شعر نہیں پڑھ سکتا اور

معلوم نہیں کیوں منٹو کو اپنے افسانوں میں شعر استعمال کرنے سے ایک طرح کی چڑھ سی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منٹو کے کرداروں کی دنیا ہر زندگی کے تلخ حقائق واقعتاً شعر و شاعری پر غالب آ گئے ہیں۔

کردار نگاری کے دو اقسام ہیں۔ داخلی کردار نگاری اور خارجی کردار نگاری۔ منٹو نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر داخلی کردار نگاری پر زور دیا ہے۔ داخلی کردار نگاری میں کردار کے ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی باتوں پر دھیان دیا جاتا ہے۔ منٹو کے جتنے افسانے ہیں۔ وہ سب زیادہ تر ایک طرح سے نفسیاتی افسانے ہیں اس لیے ہمیں داخلی کردار نگاری کی بہت زیادہ مثالیں ملتی ہیں۔ ہاں وقت ضرورت منٹو نے خارجی کرداروں سے بھی کام لیا ہے لیکن ایسا کم ہوا ہے۔

منٹو اشاروں اور کنایوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیات اور ان کے ردعمل کا جائزہ لیتا ہے۔ منٹو کے کردار طرح طرح کے ہیں اور وہ ان سب کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہے۔

''نعرہ'' میں گالیوں والے واقعے کی تکرار سے منٹو نے آہستہ آہستہ کیشو لال کے ذہنی اور جذباتی ہیجان میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر کے اس انجام کے لیے نفسیاتی اور فنی جواز پیدا کیا ہے جس میں کیشو لال کے دل کا سارا درد اور اس کی شخصیت کا سارا کرب و اضطراب سمٹ کر وہ نعرہ بن گیا ہے جس سے کیشو لال کے دل کو ضرور تسکین مل گئی لیکن سننے والوں نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ ''پگلا'' ہے۔

''بلاؤز'' میں منٹو نے مومن کی داخلی کردار نگاری کی ایک اچھی مثال دی ہے۔ اس کہانی کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

''شکیلہ کی سفید بغل میں کالے کالے بالوں کا ایک گچھا نظر آ گیا..........

..........'' یہ گچھا اسے بہت بھلا معلوم ہوا۔ ایک سنسنی سی اس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ ایک عجیب و غریب خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ یہ کالے کالے بال اس کی مونچھیں بن جائیں۔''

مومن کے دل میں اس کے بعد دھندلے دھندلے خیال پیدا ہوتے رہے لیکن

وہ ان کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا اور آخر ایک دن جب اس نے اپنا ٹرنک کھول کر اپنے عید کے لیے بنے ہوئے نئے کپڑوں پر نظر ڈالی تو............

—— ''رومی ٹوپی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کا پھندنا آ گیا اور پھندنا فوراً ہی ان کالے کالے بالوں کے گچھے میں تبدیل ہو گیا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھا تھا۔''

اور پھر کمرہ صاف کرتے ہوئے اس نے سائن کی چمکیلی کترنیں جیب میں رکھ لیں اور اگلے دن یوں ہی الگ بیٹھ کر ان کے دھاگے الگ کرنے شروع کر دیے۔

''حتیٰ کہ دھاگے کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں کا ایک گچھا سا بن گیا۔ اس کو ہاتھ میں لے کر وہ دباتا رہا مسلتا رہا—— لیکن اس کے تصور میں شکیلہ کی وہی بغل تھی جس میں اس نے کالے کالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا دیکھا تھا۔''

اس کے بعد وہ جب بھی اندر اگر...... بلاؤز کو دیکھتا تو......

''اس کا خیال فوراً ان بالوں کی طرف دوڑ جاتا جو اس نے شکیلہ کی بغل میں دیکھے تھے۔''

''ہتک'' میں سوگندھی کی خارجی کردارنگاری کی ایک اچھی مثال ہے——

''وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا، جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگ اختیار کر گیا تھا، جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔''

منٹو کا ایک کرداری افسانہ ہے ''موذیل''۔ اس میں مواقع بھی بڑے تیکھے تیکھے ہیں۔ ہندو مسلم فسادات کے دوران میں ایک جیوٹ یہودن ایک سکھ دوشیزہ کو اپنی جان کی قربانی دے کر بچاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ سکھ لڑکی موذیل کے ایک چاہنے والے کی منسوبہ ہے۔ موذیل کی کردار نگاری میں منٹو کا فن اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے اور اسی لیے ''موذیل'' منٹو کے افسانوں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

''کرپال کور جواب دینے والی ہی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ '' پکڑ لیا تو اچھا ہوا— تم یہ کپڑے اتار دو''۔ کرپال کور ابھی سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیض اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنایا۔ یہ خود ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر ترلوچن سے کہنے لگی، جاؤ اسے لے جاؤ! لیکن ٹھہرو یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے کہا! جاؤ جلدی نکل جاؤ، ترلوچن نے اس سے کہا۔ ''آؤ''— مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے ہوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔''

''تم جاتے کیوں نہیں ہو؟ موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا''

''ترلوچن نے کہا'' اس کے ماں باپ بھی تو ہیں''۔

''جہنم میں جائیں وہ'' تم اسے لے جاؤ۔

اس افسانے کے اختتام میں ہم داخلی کردار نگاری کی بہترین مثال پاتے ہیں—

''موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔

'' لے جاؤ اس کو۔ اپنے مذہب کو۔ اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔ '' خارجی کردار نگاری کی چند مثالیں دیکھیے—

''— اس کے ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمیوں کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں۔

پھڑک رہا تھا، جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔''

— ''مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے

ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔[1]''

''موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔[2]''

ایسی مثالیں ''نامکمل تحریر''، ''مصری کی ڈلی''، ''قاسم''، ''کالی شلوار''، ''لالٹین''، ''پھولوں کی بارش''، ''سڑک کے کنارے''، ''ممی''، ''بابو گوپی ناتھ'' وغیرہ افسانوں سے بکثرت پیش کی جاسکتی ہیں۔

داخلی کردار نگاری کی چند مثالوں پر اکتفا کرتی ہوں—

''سوگندھی دماغ میں رہتی تھی، لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات، کوئی کومل بات، اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیل جاتی۔[3]''

—''ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔[4]''

—''مامتا کی گرمی اس کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی۔ اور اس کی دودھ بھری چھاتیوں کی گولائیوں میں مسجد کے اجلے پاکیزہ میناروں کی سی تقدیس نظر آرہی تھی۔ وہ ماں بن رہی تھی۔[5]''

—''میں نے اپنی پھڑپھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی، اس کے وجود کی تکمیل کی تھی اور اس کے وجود کے ذرّوں سے اپنی ہستی کی تعمیر و تکمیل کی تھی......''[6]

---

[1] ہتک

[2] ہتک

[3] سڑک کے کنارے

[4] سڑک کے کنارے

[5] دھواں سعادت حسن منٹو

[6] موذیل

منٹو کی نظر بلا کی تیز ہے اور اس کا مشاہدہ انتہائی شدید ہے۔ اس کی متجسس نظر زندگی کے اس بکھرے ہوئے انبار میں سے بے بہا موتی چنتی ہے۔ ایسے موتی جسے اپنے موتی ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن وہ اسے ڈھونڈتا رہتا ہے اور بعض دفعہ اس غلاظت میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن جب بھی اس کے ہاتھ کوئی گوہر آبدار آتا ہے تو وہ بڑے فخر سے سینہ تانے اسے دکھاتا ہے اور کہتا ہے ''دیکھ لو اتنی خوبصورتی، اتنا حسن، اتنی انسانیت تم نے کہیں اور بھی دیکھی ہے۔'' یہ انسان جو بازاروں میں بکتا ہے۔ دلال بنتا ہے، جو خوشیا ہے، بابو گوپی ناتھ ہے اس کے دل میں ہنوز انسانیت کی جوت مری نہیں ہے اور عورت جو سربازار اپنے جسم کو ننگا کر کے دکان سجاتی ہے۔ یہ عورت جو سوگندھی، کانتا، سلطانہ ہے۔ اس کے احساسات میں وہ عورت بھی زندہ ہے اور کبھی کبھی سانس لیتی ہے، جو ایک بیوی، ایک بہن، ایک ماں بھی بن سکتی تھی۔

سلطانہ چکلے کی ایک عورت ہے۔ اس کا پیشہ وہی ہے جو چکلے کی عورتوں کا ہوتا ہے۔ چکلے کی عورتوں کو کون نہیں جانتا۔ قریب قریب ہر شہر میں ایک چکلہ موجود ہے۔ بدرو اور موری کو کون نہیں جانتا۔ ہر شہر میں بدروئیں اور موریاں موجود ہیں جو شہر کی گندگی باہر لے جاتی ہیں...... منٹو کے یہاں ہم انفرادیت پاتے ہیں۔ منٹو کے خیال کے مطابق ہم اگر مرمریں غسل خانوں کی باتیں کر سکتے ہیں، اگر ہم صابن اور لیونڈر کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان موریوں اور بدرووں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے بدن کا میل پیتی ہیں، اگر ہم مندروں اور مسجدوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان قحبہ خانوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے۔ جہاں سے لوٹ کر کئی انسان مندروں اور مسجدوں کا رخ کرتے ہیں، اگر ہم افیون، بھانگ، چرس اور شراب کی بھٹیوں کا ذکر کر سکتے ہیں تو ان کوٹھوں کا ذکر کیوں نہیں کر سکتے، جہاں ہر قسم کا نشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

منٹو نے ویشیا اور ویشیا کے کوٹھے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ہم ویشیا کے کوٹھے پر نماز یا درود پڑھنے تو نہیں جاتے، وہاں ہم جس غرض سے جاتے ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہاں ہم اس لیے جاتے ہیں کہ وہاں جا کر ہم مطلوبہ جنس بے روک ٹوک خرید سکتے ہیں۔ جب وہاں جانے کی ہمیں کھلی اجازت ہے، جب ہر عورت اپنی مرضی سے ویشیا بن

سکتی ہے اور ایک لائسنس لے کر جسم فروشی کر سکتی ہے جب یہ تجارت قانوناً جائز تسلیم کی جاتی ہے تو اس کے متعلق ہم بات چیت کیوں نہیں کر سکتے؟ اور منٹو نے کھل کر ویشیا کے متعلق کہا۔

عام طور سے اردو داستانوں اور افسانوں میں ہم نائیوں، دھوبیوں، کنجڑوں اور بھٹیاروں کے متعلق بات چیت پاتے ہیں چوروں، اچکوں، ٹھگوں، اور رہزنوں کے قصے سنتے ہیں۔ جنوں اور پریوں کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب آسمان کی طرف شیطان بڑھنے لگتا ہے تو فرشتے تارے توڑ توڑ کر اسے مارتے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بیل اپنے سینگوں پر ساری دنیا اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم داستان امیر حمزہ اور قصہ طوطا مینا کی تصنیف میں، عمرو عیار کی ٹوپی اور زنبیل کی باتیں پڑھتے ہیں۔ ہم جادوگروں کے منتروں اور ان کے توڑ کی باتیں سنتے ہیں۔ لیکن منٹو نے ان سب چیزوں کے ذکر کے بجائے ویشیا کا ذکر کیا ہے۔ منٹو کہتا ہے—

''ہم ویشیا کے متعلق کیوں نہیں سوچ سکتے، اس کے پیشے کے بارے میں کیوں غور نہیں کر سکتے ان لوگوں کے متعلق کیوں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو ان کے پاس جاتے ہیں؟''

ہم ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کا باہمی رشتہ معاشقہ کرا سکتے ہیں، ان کی پہلی ملاقات داتا گنج بخش مزار میں کرا سکتے ہیں۔ ایک دلال بڑھیا بیچ میں لا سکتے ہیں جو ان دو بچھڑی روحوں کو بار بار ملاتی ہے ہم آخر میں ان کے عشق کو ناکام بنا سکتے ہیں، دونوں کو زہر پلوا سکتے ہیں، ان دونوں کے جنازے ایک اس محلے سے اور ایک اس محلے سے نکلوا سکتے ہیں، پھر ان دونوں کی قبریں ایک معجزے کے ذریعے آپس میں ملا سکتے ہیں اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پھولوں کی بارش بھی کرا سکتے ہیں۔ یہ چیزیں ہم عام طور سے اپنی آئے دن کی زندگی میں دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن منٹو کی نظر ان سطحی چیزوں پر نہیں جاتی، وہ ان عام باتوں کا ذکر، عام انسانوں کا ذکر اپنے افسانوں میں نہیں کرتا۔ منٹو کہتا ہے کہ بجائے ان چیزوں کے ذکر کے ہم ویشیا کی زندگی کیوں بیان نہیں کر سکتے۔ اسے تو فرشتوں اور ان کے پھولوں کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اگر مرتی ہے تو دوسرے محلے سے کوئی جنازہ اس کی موت کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی قبر اس کی قبر سے ملنے کی خواہش نہیں کرتی۔''

سلطانہ، سوگندھی، کانتا، سراج وغیرہ ویشیا ہیں یہ لوگ ٹھیٹ قسم کے دکاندار ہیں اور اگر ہم شراب کی بوتل لینے جائیں تو یہ توقع نہیں کریں گے کہ وہ عمر خیام بنا بیٹھا ہوگا، یا اس کو حافظ کا سارا دیوان یاد ہوگا، شراب کے ٹھیکے دار شراب بیچتے ہیں، عمر خیام کی رعبائیاں اور حافظ شیرازی کے شعر نہیں بیچتے۔

منٹو کی سلطانہ عورت بعد میں ہے کیونکہ انسان کی زندگی میں اس کا پیٹ سب سے زیادہ اہم ہے۔

''شنکر اس سے پوچھتا ہے، ''تم بھی کچھ ضرور کرتی ہوگی؟''

''سلطانہ جواب دیتی ہے، ''جھک مارتی ہوں''

وہ یہ نہیں کہتی کہ میں گندم کا بیوپار کرتی ہوں یا سونے چاندی کی تجارت کرتی ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اگر کسی ٹائپسٹ سے پوچھا جائے کہ تم کیا کام کرتے ہو تو وہ یہی جواب دے گا ''ٹائپ کرتا ہوں'' سلطانہ اور ایک ٹائپسٹ میں کیا فرق ہے؟—اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔

اس طرح منٹو کے کردار اپنی ایک الگ شخصیت اور انفرادیت کے حامل ہیں۔

منٹو نے زندگی کے ہر رخ پر اپنی تیز نظر ڈالی ہے۔ اس کے افسانوں کے بے شمار کرداروں میں تقریباً سبھی سمٹ کر آجاتے ہیں، کلرک، مزدور، طوائف، بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، فلم اسٹار، دلال، زاہد، پاکباز اور رند خرابات وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس کی نگاہ ہر جگہ پہنچتی ہے اور جب بھی وہ کسی کردار کا ذکر کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے احساسات کے باریک سے باریک پردے میں جھانک آیا ہے اور اس شخص کی روح اس کے سامنے ننگی پڑی ہوئی ہے۔ منٹو کے کردار اسی دنیائے آب وگل کے رہنے والے ہیں، وہ بھی اسی گوشت و پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں بھی جذبات، احساسات ہیں، ان کے یہاں بھی ایک انسان کی ذاتی کمزوریاں اور خوبیاں ہیں۔ منٹو نے اپنے کرداروں کا انتخاب عام طور پر ان لوگوں کا کیا ہے جو ہیں تو ہمارے ہی دنیا کے باشندے جو ہمارے ہی درمیان رہتے ہیں، پلتے ہیں، بڑھتے ہیں اور ایک دن موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں، لیکن جن کی

طرف ہماری نظریں ہمدردانہ نہیں اٹھتی ہیں بلکہ ایک نفرت بھری ہوئی نگاہ ہوتی ہے۔ ہم اپنے سماج میں ان کو جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے حالانکہ رات کی سیاہی میں ہم اپنے سماج میں ان کے یہاں جانا پسند کرتے ہیں اور ان سے ایک وقتی لذت حاصل کرتے ہیں۔

منٹو نے ان کرداروں کے ذریعے ہمیں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انھیں بھی جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہمیں، یہ بھی زندگی کا مزہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی اپنا ایک الگ گھر اپنی ایک الگ دنیا چاہتے ہیں۔ ان کی بھی کچھ خواہشات ہیں۔ ان کے دل میں بھی ماں بننے کا ارمان، بہن اور بیوی بننے کی تمنا ہے لیکن ہم نے انھیں مجبور کر رکھا ہے۔ سماج نے اپنی برائیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ سارے سماج کی غلاظت کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ وہ سماج کی برائیوں کو اپنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو سماج کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے کہ پیٹ کی آگ سب سے بری آگ ہے۔ جہاں وہ رہتی ہے اس مکان کا اسے کرایہ دینا پڑتا ہے اور جو بجلی وہ استعمال کرتی ہے اس کا بھی اسے پیسہ دینا پڑتا ہے اور چونکہ یہ بھی مفت نہیں مل سکتی اور نہ رہنے کے لیے مکان ہی کرائے کے بغیر مل سکتا ہے اس لیے اسے مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ وہ اگر بیاہی ہوتی تو اسے یہ سب چیزیں مفت مل جاتیں لیکن وہ بیاہی نہیں ہے۔ محض ایک عورت، ایک رنڈی، ایک طوائف، ایک ویشیا ہے.......... اور جب عورت کو بھی بجلی کے پیسے دینے پڑیں، گھر کا کرایہ ادا کرنا پڑے اور جو دلاّل کے ہاتھوں چڑھ جائے تو ظاہر ہے کہ وہ ایسی عورت نہیں ہوگی جو ہم اپنے گھروں میں دیکھتے ہیں۔

یہ انسان جو ''بابو گوپی ناتھ'' ہے، ''ممد بھائی ہے اور یہ عورت جو ''ممی'' ہے جو ''موذیل'' ہے، ''سوگندھی'' ہے۔ اس کے افسانوں کے ہیرو اور ہیروئن ہیں۔ ان کے دل میں بھی ایک درد، ایک کسک ہے۔ ان کے جسم کے خون میں بھی گرمی ہے اور ان سے بھی وہ حرکات سرزد ہوتے ہیں جو ہم اور آپ سے ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے منٹو کے کردار زندگی سے بہت قریب ہیں بلکہ میں یہاں تک کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ زندگی سے نزدیک ہی نہیں زندگی کا ایک حصہ ہیں، زندگی کا ایک ٹکڑا ہیں، ہمارے اور آپ کی زندگی کے درمیان کا ایک حصہ۔

منٹو اس اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتا کہ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا

ہے۔ اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اسی لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام متنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ اس نے زندگی کے حقائق کو اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے یہاں خود بخود زندگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس زندگی میں جو کچھ بھی ہے، جو کچھ بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تھا اور جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے، منٹو اس تفصیل و جزئیات کو پیش کرنے کا حسن سلیقہ رکھتے ہیں، یہی اس کی واقعیت ہے اور ایک بڑے فنکار کی پہچان ہے۔ منٹو نے ان حقائق کو ایک فوٹو گرافر کی طرح پیش نہیں کیا بلکہ ایک مصور کی طرح ان کی تصویریں بنائی ہیں اور مرقعے تیار کیے ہیں۔

زندگی جس روپ میں بھی اس کے سامنے آئی ہے، اس نے ہو بہو اس کو اسی طرح پیش کر دیا ہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس کو پیش کرتے ہوئے وہ کھل کر بہت کچھ نہ کرنے کے باوجود کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی آواز جگہ جگہ اس کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اس زندگی کے سماجی پہلو کا گہرا شعور نہیں رکھتا اس لیے اس کے یہاں انسان اور انسانیت کی آواز بڑی حد تک صدائے بازگشت بن جاتی ہے، لیکن اس کا احساس اتنا شدید، اس کی نظر اتنی گہری اور اس کا تخیل اتنا بلند ہے کہ وہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی زندگی کے سمندر سے حقائق کے موتی نکال ہی لاتا ہے۔

منٹو نے سوسائٹی اور تہذیب و تمدن کو ننگا دیکھا ہے اور اسی لیے اسے ننگا دکھایا بھی ہے اور اسی لیے لوگ اسے دیکھ کر سٹپٹا بھی جاتے ہیں، ان میں گھبراہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس حقیقت کا وجود اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ سوسائٹی ننگی اور تہذیب و تمدن برہنہ ہے۔ منٹو اس برہنگی کا فنکار ہے اس لیے زندگی کی مذمومات پر اس کی نظریں بڑی گہری پڑتی ہیں۔ وہ اس سلسلے کی تمام حقیقتوں کو معلوم کر لیتا ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ منٹو کے یہاں رومانیت نام کو بھی نہیں ہے۔ اس نے زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کو اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ شاید جدید افسانہ نگاروں میں وہ واحد فنکار ہے جس کے مزاج میں رومانیت کا اثر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو تخیل پرست نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، اسی کو اپنے فن کا موضوع بناتا ہے۔ خارجی حالات کو دیکھ کر جو باتیں اس کے

ذہن میں آتی ہیں انھی کی تفصیل و جزئیات کو پیش کرتا ہے۔ منٹو نے اپنی طرف سے خیالی دنیا نہیں قائم کی ہے۔ اپنی طرف سے اس نے بہت کم باتیں کہی ہیں جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اس کے لبوں پر آ گیا ہے اور تفصیل اس کے قلم سے افسانوں کی شکل میں ٹپک پڑی ہے۔ اسی لیے رومانی پہلو اس کے یہاں ذرا بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے آخر تک زندگی کی سنگین اور تلخ حقیقتوں کا ترجمان اور عکاس ہی رہتا ہے۔ منٹو زندگی اور اس کے مختلف شعبوں سے قریب رہا ہے۔ اس نے ان میں سے ہر ایک میں گہری دلچسپی لی ہے۔ اس کی ایک ایک بات کو اس نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ ایک ایک پہلو کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح زندگی کی تمام حقیقتیں اس پر بے نقاب ہو گئی ہیں۔

موضوعات کے تنوع سے اس نے اس میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ منٹو زندگی کا فن کار ہے اور زندگی تنوع سے عبارت ہے۔ اس لیے اس کے افسانوں کے موضوعات میں زندگی کی طرح تنوع نظر آتا ہے۔ منٹو نے زندگی کے سماجی اور عمرانی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ عام انسانی مسائل کو سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ نفسیاتی حقائق پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ غرض اس کے یہاں زندگی کے تمام پہلو اپنی ساری رنگارنگی کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں۔ منٹو نے ان سب کی تفصیل و جزئیات کو گہرے مشاہدے کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان سب کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس کا زاویۂ نظر انسانی رہا ہے۔ منٹو کے یہاں اس انسانی زاویۂ نظر کے مختلف روپ ہیں اور اس کے ہر افسانے میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ضرور دکھائی دیتا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے مختلف اور متنوع موضوعات کی بنیادیں اسی زاویۂ نظر پر استوار کی ہیں۔ یہ انسانی زاویۂ نظر منٹو کے یہاں زندگی کے عام حقائق کی ترجمانی اور عکاسی میں ممد و معاون ہوتا ہے اور اس طرح اس کی حقیقت نگاری اس کو اپنے وجود کے لیے سہارا بنا لیتی ہے۔

یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ منٹو کے فن نے سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کی آغوش میں آنکھ کھولنے کے باوجود ان معاملات کی طرف ایسی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی اقدار کی ناہمواری کا احساس رکھتے ہوئے بھی ان معاملات سے

متعلق کوئی بڑی گہری باتیں نہیں کہہ سکا ہے۔ صرف جگہ جگہ چند تاثرات کا اظہار ہے۔ ان تاثرات میں کسی قسم کی کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ ماحول کی ایک تصویر ضرور سامنے آجاتی ہے۔ حالات کا ایک نقشہ ضرور آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جستہ جستہ تو یہ کیفیت منٹو کے بہت سے افسانوں میں مل جاتی ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس سلسلے میں اس کے افسانے ''نیا قانون'' اور ''نعرہ'' ایک نمایاں حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں ان میں گہرے سیاسی اور سماجی شعور کی تصویریں تو نہیں ہیں لیکن ان کو پڑھنے کے بعد ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اپنے زمانے کے بعض حالات نے منٹو کو متاثر ضرور کیا ہے۔ اپنے تاثرات کا اظہار ان افسانوں میں ملتا ہے اور یہ تاثرات محض حالات کی عکاسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھتے۔

''نیا قانون'' بظاہر تو ایک کوچوان استاد منگو کے بعض خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اس زمانے کے سیاسی حالات کی ایک تصویر بنائی ہے اور سیاسی حالت نے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے۔ منٹو کی پرواز اس حد تک نہیں ہے۔ اس کی نظر تو صرف کشمکش میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن ویسے اس کیفیت کی ترجمانی اس نے بڑی چابکدستی سے کی ہے۔ دراصل وہ دکھانا یہ چاہتے ہیں کہ استاد منگو جس کو سب نہایت عقلمند آدمی سمجھتے ہیں، ایک ہونے والی سیاسی تبدیلی کو نہیں سمجھتا ہے۔ اس کا فریب کھاتا ہے یہ نہیں جانتا کہ حقیقت کیا ہے اور اس کے نتیجے میں اسے جیل خانے کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ اس مختصر کہانی میں کئی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ ہندوستانی عوام کی انگریز سے نفرت، تبدیلی کی خواہش، آزاد ہونے کا خیال، سرمایہ داروں کی دست درازی، اشتراکی نظام کی استواری، تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری، سب اپنی اپنی جگہ پر حقیقتیں ہیں۔ منٹو نے ان کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے۔ ہر چند کہ ان حقیقتوں کے پیش کرنے میں کوئی بہت واضح سیاسی نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن جو حالات ہیں ان کی عکاسی ہی نے اسے حقیقت نگاری کی سرحد میں داخل کر دیا ہے۔

منٹو سیاسی معاملات کے ساتھ ساتھ معاشی اقدار کی ناہمواری کے باعث پیدا

ہونے والی الجھنوں اور پریشانیوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ بہت سے افسانوں میں اس کی طرف اشارے ہیں لیکن ''نعرہ'' میں اس نے جو صورت حال کو بڑی خوبیوں سے پیش کیا ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں مفلسوں کی زبوں حالی اور اس زبوں حالی کے زیر اثر پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی حقیقت سے بڑی بھرپور تصویر بنائی ہے۔ منٹو اس نظام میں ایک فرد کی بے بسی کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام کے تضاد کو واضح کرتا ہے۔ جگہ جگہ اس میں ردعمل کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں۔ انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ایک نئے نظام کی تمنا بھی اپنے آپ کو کہیں کہیں رونما کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کی تان ایک احساس شکست ہی پر جا کر ٹوٹی ہے۔ منٹو اسی حقیقت کو دکھانا چاہتا ہے کیوں کہ موجودہ نظام کے ہاتھوں یہی بات حقیقت بن گئی ہے۔ اسی لیے منٹو کے یہاں ان معاملات کو پیش کرتے ہوئے کوئی جارحانہ انداز پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے کردار عمل اور انقلاب کے بارے میں سوچتے ضرور ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ حالات نے انھیں بے بس بنا دیا ہے۔ منٹو اس لیے زندگی کے ان پہلوؤں کا صرف عکاس بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن اس کی یہ عکاسی بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس عکاسی میں وہ قدم قدم پر کچھ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ زندگی کو سدھارنے کا پیام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

منٹو کی حقیقت میں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹ کی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود اپنا پیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بدحالی میں گذرتی ہے۔ اس کو ساری زندگی جذباتی اعتبار سے ناآسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے۔ ''ہتک'' کی سوگندھی، ''خوشیا'' کی کانتا اور ''کالی شلوار'' کی سلطانہ سب معاشی اعتبار سے بدحال اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ ہیں۔ منٹو نے ان طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں اس ماحول کی زندگی سے بڑی بھرپور تصویریں ہیں۔ منٹو جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقدار کے خلاف احتجاج کرتا ہے جس نے صدیوں سے طوائف کو باقی رکھا ہے وہ اپنی زبان میں کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے، ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ

منٹو اس غلط سماجی نظام کا دشمن ہے۔ وہ اس نظام اقدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کرتا لیکن اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور ابھارتا ہے۔ لیکن یہ نفرت محض نفرت نہیں رہتی، کیونکہ اس کی حدیں انسانی ہمدردی سے جا ملتی ہیں طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر منٹو کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

منٹو نے اپنے محدود شعور کی روشنی میں زندگی کے مختلف اور متنوع حقیقتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس نے جن حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا ہے وہ ہماری زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اس نے اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی زندگی کے بدلتے ہوئے معاملات و مسائل سے موضوعات منتخب کیے ہیں اور اس سلسلے میں اس کا زاویہ نظر ہمیشہ ترقی پسندانہ رہا ہے۔ اس کے افسانوں میں جو حقیقتیں نظر آئی ہیں وہ اس کے تخیل کی پیداوار نہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔ منٹو نے خارجی طور پر انھیں سماجی زندگی میں دیکھا ہے۔ اسے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی بڑی کاوش نہیں کرنی پڑی ہے۔ زندگی کے شدید احساس اور حالات کے گہرے شعور نے انھیں اس کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اس کی دوررس اور دور بیں نظریں ان سب پر حاوی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس نے ان حقیقتوں کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس کے یہاں جگہ جگہ ان میں سے بعض نئی حقیقتوں کے پیکر ابھرتے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔

منٹو اپنے تیز مشاہدے، بلند تخیل اور فکر کی بدولت اپنے افسانوں کے لیے ایک ایسا ماحول اور فضا قائم کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے سارے واقعات اس نئے ماحول اور نئی فضا کی ان گنت تصویریں آتی ہیں اور گذر جاتی ہیں لیکن افسانہ ختم کرنے کے بعد افسانہ نگار کا موقلم کچھ ایسا نقش بناتا ہے کہ ساری تصویریں گڈمڈ ہو کر دھندلا جاتی ہیں اور سارے نقوش میں سے بس ایک نقش، کوئی ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور اس طرح وہ اپنے افسانے کی ساخت، تشکیل اور تعمیر بہت شعوری طور پر کرتا ہے۔ وہ پہلے ہی سوچ لیتا ہے کہ اپنے افسانوں کے ذریعے اسے کون سا نقش قاری کے ذہن پر ثبت کرنا ہے۔ وہ افسانے کا ایک ڈھانچہ بناتا ہے، پھر افسانے کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتا ہے اور جب

افسانہ ختم ہوتا ہے تو پڑھنے والا افسانہ کے مجموعی تاثر کو فطری انداز میں قبول کرنے کے لیے ذہن اور جذباتی طور پر تیار ہو چکا ہوتا ہے۔

وہ موضوع کے انتخاب میں اتنا شدت پسند ہونے کے باوجود موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجہ کا باشعور اور متوازن فنکار بن جاتا ہے۔ مختصر افسانہ کی تکنیک کو پورے خلوص، دیانت داری، احتیاط اور فنی تکمیل کے ساتھ برتنے میں اردو افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ اس کا دوسرا کوئی حریف نہیں۔ یہی فن ہے، جو منٹو کو ایک انفرادی حیثیت اور عظمت عطا کرتا ہے شاید اسی لیے حسن عسکری نے لکھا ہے کہ موضوع اور ہیئت دونوں میں منٹو کی حیثیت ایک پیش رو کی ہے۔

منٹو کے فن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں کو بھی حسن وخوبی و تاثیر کے ساتھ پیش کرتا ہے اور داخلی کوائف و حقائق کو خارجی حقیقتوں کی مدد سے مصوّر کر دیتا ہے۔ جیسے جیسے منٹو پختہ کار ہوتا گیا تو وہ خارجی حالات و حقائق کو داخلی معنویت بھی عطا کرنے لگا۔ بقول اختر اورینوی ـــ

> ''حقیقت نگاری ہو، رومان آفرینی ہو، یا مثالیت پسندی، فنکار بغیر اثر پذیری، ترک و انتخاب حقائق نگاری، آمیزش و ترکیب، تعمیر و تراش، تشریح و تعبیر، ہیئت سازی، قماش بندی، معنی آفرینی اور تاثیر خیزی، کامران و بامراد نہیں ہو سکتی۔ محض عکاس بھی فنکار ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی عکاسی کے ساتھ کچھ اور ہنر دکھائے۔ ورنہ اس کا عمل فطرت کی کاربن کاپی یا زری آئینہ داری ہو کر رہ جائے گا۔''

منٹو محض عکاس حیات ہرگز نہیں۔ وہ مصور ہے، وہ فنکار ہے۔ جہاں وہ نا کامیاب ہے اور جتنا نا کامیاب ہے، اس کی پرکھ ہونی چاہیے۔ منٹو نے بکثرت تخلیقی حقیقت نگاری کی ہے۔ ''ہتک''، ''موذیل''، ''ممی''، ''سڑک کے کنارے'' صرف زندگی کی عکاسی یا فوٹوگرافی نہیں، ان افسانوں میں ترکیب جدید، تعمیر جدید اور تخلیق جدید ہے۔ منٹو کے افسانوں میں ہمیں مختصر افسانے کی تکنیکی خوبی کے ساتھ وہ سارے فن سازی کے رمز ملتے ہیں جن کے بغیر

افسانہ آرٹ نہیں رپٹ بن جاتا ہے۔”

منٹو اردو افسانہ نگاروں میں اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس کے افسانوی تجربوں میں کثرت اور تنوع ہے۔ پھر کہانی کہنی بھی جانتا ہے۔ اس کے افسانوں میں فن کی کوئی اور خوبی نہ ہو تو قصہ پن ضرور ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے معمولی واقعات، حالات اور باتوں سے افسانہ نگاری کی باکمال صلاحیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس کا افسانہ ''قبض''، ''الو کا پٹھا''، ''چوہے دان'' وغیرہ۔

منٹو کو اپنی کمزوری کا خود احساس ہے۔ کم از کم یہ احساس نیم شعوری ضرور ہے۔ غالباً اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں منٹو کو اس طرح کے خیالات آتے تھے۔

''داستان سنانے کے دوران مجھے سامعین کے تیوروں سے ہمیشہ اس بات کا احساس ہوا کہ میرا بیان غیر مربوط ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ چونکہ میری داستان میں ہمواری کم اور جھٹکے زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے میں اپنے محسوسات کو اچھی طرح کسی کے دماغ پر منتقل نہیں کرسکتا۔ .... میں اکثر اوقات اپنی داستان سناتے سناتے جب اپنے مقام پر پہنچا ہوں کہ یاد میرے ذہن میں موجود نہ تھی اور وہ خیالات کی رو میں خود بخود بہہ کر چلی تھی تو میں غیر ارادی طور پر اسی نئی یاد کی گہرائیوں میں گم ہو جاتا ہوں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرے بیان کا تسلسل یک لخت منتشر ہو جاتا ہے اور جب میں ان گہرائیوں سے نکل کر داستان کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو جوڑنا چاہتا ہوں تو عجلت میں وہ ٹھیک طور سے نہیں جڑتا ....

میرے ذہن کی زبان بہت تیز ہے اور اس کو قابو میں رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔[1]''

رفتہ رفتہ منٹو کے افسانوں میں جھٹکے کم اور ہمواری زیادہ ہوتی گئی اور آہستہ آہستہ اسے ذہن کی زبان پر قابو حاصل ہوتا گیا اور اس کے فن میں پختگی، تراشیدگی، سجل پن اور رسائی پیدا ہوئی۔ منٹو معاشرتی، جذباتی، ذہنی اور نفسی کیفیات، حالات اور جزئیات سے اچھی طرح واقف ہے اور انھیں افسانہ کی ساخت ترکیب و تعمیر کے فنی چوکھٹے میں بخیر و خوبی استعمال کرتا ہے۔ اس کے ہاں تکرار، تضاد، ندرت، اخلاص، طنز، دردمندی اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔

منٹو کے افسانوی فن کو اگر اسلوب اور اظہار کے ان وسائل کے نقطۂ نظر سے

---

[1] لالٹین

پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی جائے تو سب سے پہلی چیز جو پڑھنے والے کو شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہے یہ ہے کہ منٹو کے پاس معمولی سے معمولی بات کے اظہار کے لیے ایک غیر معمولی انداز موجود ہے۔ فقرہ کی ساخت میں معمولی سی تبدیلی، لفظوں کے برتنے میں تھوڑی جدت پسندی اور بہت اہم اور بڑی گہری بات کو اس طرح ادا کر دینے کی قدرت کہ جیسے وہ بات نہ اہم ہے اور نہ عمیق۔ منٹو کے انداز اسلوب کے بعض واضح پہلو ہیں۔

منٹو نے اپنے افسانوں میں سیدھے سادے روزمرّہ کی بول چال کے جملوں سے ایسی مثالوں اور تشبیہوں سے جو دوسروں کی نظروں میں بالکل حقیر اور بے حیثیت ہیں اور ایسے چلتے ہوئے فقروں سے جن میں سنجیدگی و متانت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، گہری سے گہری، سنجیدہ سے سنجیدہ اور موثر سے موثر بات کہنے کا کام لیا ہے اور ہر جگہ اس سادگی اور عمومیت کو تصور آفریں، فکر انگیز اور خیال افروز بنا دیا ہے۔ پھر بھی بہت کم مقامات ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر قاری کے دل میں یہ بات آتی ہو کہ دوسروں کے فکر اور تخیل کی شمع جلانے والے منٹو نے یہ باتیں کہنے کے لیے اپنے ذہن پر زور دیا ہے۔ منٹو نے جو کچھ کیا ہے اس میں آورد نام کو نہیں، ایک ایسی آمد ہے جو شخصیت کے زور اور اس کے بے لوث خلوص کی مظہر ہے۔ منٹو کے پورے اسلوب پر یہی بے تکلفی اور بے ساختگی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا پرتو ہمیں منٹو کی ان تشبیہوں میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً استاد منگو نے فوجی گوروں کے چہرے کا جو تصور ہمارے سامنے پیش کیا ہے، دیکھیے وہ کس قدر مکروہ اور گھناؤنا ہے—

"ان کے لال جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلّی گل گل کر جھڑ رہی ہے۔[1]"

منٹو کے دل میں کسی چیز، کسی واقعہ یا شخص کا جو تصور ہے اسے دوسرے کے ذہن تک جیوں کا توں پوری طرح منتقل کرنے کے لیے منٹو کے پاس الفاظ، فقروں اور جملوں کی کمی نہیں، اسی طرح ان کا ذہن تازہ ہے۔ مشکل سے مشکل ذہنی اور جذباتی تجربہ کو اس کی نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ دوسرے تک پہنچانے کے لیے ایسی تشبیہیں وضع کر لینے پر قادر ہے

---

[1] نیا قانون

جن کی طرف ذہن منتقل بھی نہیں ہوتا، یہی خصوصیت اوپر کی مثال میں ہے۔

منٹو جس طرح الفاظ اور جملوں کے ذریعے محبت، نفرت، حقارت، رشک، حسد، خلوص، صداقت اور رحم و کرم کے احساسات میں قاری کو پوری طرح اپنا ہم نوا بنا سکتے ہیں اسی طرح اکثر بالکل معمولی تشبیہوں سے وہ ہر طرح کے احساس اور جذبہ کو اس طرح جیتا جاگتا بنا کر پڑھنے والے کے ذہن میں اتار دیتے ہیں۔ کہ وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو افسانہ نگار کے سپرد کر دیتا ہے۔ استاد منگو کی زبان سے مارواڑیوں کو غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل کہلوانے اور اس بات کو اس طرح مکمل کرنے میں کہ ''نیا قانون ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔'' منٹو کے فن کی یہ نمایاں خصوصیت ہے۔

منٹو کا اسلوب اظہار جس میں الفاظ، فقروں تشبیہوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ منٹو کے افسانوں میں پنجاب کے سکھ واقعی پنجاب کے سکھ ہیں۔ مراد آباد کے ظروف ساز نہیں۔ منٹو کے افسانوں میں کوچوان واقعی گھوڑا ہانکتے ہیں رئیسی نہیں فرماتے۔ ان کی بات چیت سے گھٹیا بیڑیوں ادھ جلی ماچسوں کی، موم بتیوں کی۔ پینے کی بو آتی ہے۔ مثال کے طور پر —

استاد منگو نئے قانون کی خبر سن کر آیا ہے اور یہ خبر کسی دوسرے تک پہنچانے کے لیے بے قرار ہے اتنے میں نتھو گنجا اڈے پر آتا ہے۔ منگو بلند آواز سے اس سے کہتا ہے —

''ہاتھ ادھر لا، ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔''

منگو نے جب یہ بات کہی کہ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن یہ بظاہر معمولی ہونے والی بات منگو کے نزدیک بہت اہم تھی۔ منٹو نے منگو کے مزاج اس کی ذہنی سطح اور گنجے نتھو کی مختلف خصوصیتوں کو جمع کر کے ایک ایسا جملہ لکھا جو منگو کی ذہنی کیفیت کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ منگو کی جذباتی شدت کے اظہار کے لیے منٹو نے جو جملہ وضع کیا ہے وہ منٹو کا منفرد رنگ ہے۔ ایک چلتے ہوئے غیر سنجیدہ فقرے کو ایک بے حد اہم اور گہرے مفہوم کا حامل اور ترجمان بنانا منٹو کے جدت پسند اسلوب کی ایک خصوصیت ہے۔

''کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوا اوپر ہوا، نیچے

ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا ہے اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔[1]"

"فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں، ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔[2]"

ان مثالوں میں ہر جملہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ منٹو کے طرز اور اسلوب نگارش کی اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ کسی کردار کی ذہنی کیفیت کی ساری شدتوں اور گہرائیوں کو کبھی بالکل سادہ جملوں سے، کبھی ایسی تشبیہوں اور مثالوں سے جو دوسرے لکھنے والے کو یقیناً اس موقع پر بے محل معلوم ہوتیں جہاں منٹو نے انھیں کامیابی سے برتا ہے اور کبھی بہت سی ملی جلی واضح تصویروں سے اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والا کسی طرح کی حیرت کے احساس کے بغیر اس جذباتی شدت اور گہرائی کا مکمل تاثر قبول کر لیتا ہے۔

☆☆

---

[1] ہتک

[2] دھواں سعادت حسن منٹو

منٹو کی انفرادیت

جدید اردو افسانے کے بنیاد گزار، فن افسانہ کے ماہر، صاحب طرز اور ایک خاص دور کے نثری اسلوب کے نمائندہ ادیب کی حیثیت سے اردو میں منٹو کا سب سے الگ اور نمایاں مقام ہے۔ وہ انسان کو فطرت پر مقدم جاننے والے ایسے حقیقی اور تخلیقی فنکار تھے جنھوں نے مافوق الانسانی ادب کی سختی سے مخالفت کی۔ فن اور زندگی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے منٹو کی کہانیاں زوال پذیر معاشرے کے مریضانہ کج رو، ممنوعہ یا گندے پہلوؤں کو کمال فنکاری سے عیاں کرتی ہیں۔ سالہا سال سے مسائل میں جکڑے ہوئے، کلبلائے ہوئے، سسکتے اور کچلے ہوئے انسانوں میں بھی وہ انسانیت کی رمق تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ بے باکی سے معاشرے کے ان تضادات کو پیش کرتے ہیں جن کے توسط سے اس عہد کے عصری شعور، معاشرتی و اقتصادی عدم حقیقت، اونچے طبقے کی جھوٹی اور کھوکھلی زندگی، طوائف اور جنس سے متعلقہ مسائل وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

منٹو کی افسانہ نگاری فن کی مختلف منزلوں سے گزری ہے۔ ان منزلوں میں بعض ترقی کی ہیں اور بعض تنزل کی، لیکن ان میں سے ہر منزل میں منٹو نے اپنے منصب کو برابر یاد رکھا ہے۔ اسے کہانی کے ذریعے صرف ایک چیز یا ایک بات قاری کے ذہن تک پہنچانی اور اس کے دل میں اتارنی اور جاگزیں کرنی ہے۔ وہ بات زندگی کے کسی بھی رخ یا پہلو سے اخذ کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے منٹو نے اپنے گرد و پیش کی دنیا کے جن پہلوؤں کو دیکھا انھیں ایک اہم فرض کی طرح افسانے کا موضوع بنانے کی کوشش کی۔

اُن اَن گنت اور مختلف پہلوؤں میں سیاست ہے، رومان ہے، جنسی نفسیات ہے

اور بہت کچھ ہے۔ مزدور، اس کی پیشانی کا پسینہ، غریبی اور امیری اور ان دونوں میں یک طرفہ اور خود غرضانہ تعلق، غریبی کی مایوس کُن فضا اور اس فضا میں رہنے بسنے والے ایسے لوگ جو کسی انقلاب سے غریبی اور اس کی پیدا کردہ مصیبتوں کو ختم کر دینے کے لیے بے چین ہیں۔ وہ سیٹھ، جن کے دل میں دیا نہیں اور وہ بے کار، جو دیا کی بھیک مانگتے مانگتے مرجاتے ہیں۔ نوکر ایک طرف اور آقا ایک طرف۔ پھر منٹو کی دیکھی ہوئی دنیا میں مذہب اور اس کا پیدا کیا ہوا ماحول ہے اور فلمی کمپنیوں کی بظاہر چمکیلی دنیا ہے اور اس کے علاوہ ہر طرح کے انسان جو ہر آدمی کو ملتے ہیں اور تجربات کا حصہ بنتے ہیں۔ منٹو کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہر واقعہ ہر خیال اور ہر انسان کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔

یعنی یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ منٹو کے افسانوں کا بنیادی محور عام انسانی زندگی ہے۔ اس کے تمام موضوعات اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے تمام خیالات کی بنیاد اسی انسانیت، انسانی زندگی پر استوار ہے۔ منٹو اس دائرے سے باہر نکل کر کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ اس لیے ان کے یہاں انسان اور انسانیت کی تکمیل کا جذبہ ہر حال میں کارفرما نظر آتا ہے۔ البتہ اس جذبے کے مختلف روپ الگ الگ رنگوں میں سامنے آتے ہیں۔ کہیں انسانیت کی اصطلاح ہے، کہیں انسانی جذبات کی تہذیب ہے، کہیں انسانی روابط کی اہمیت کا احساس ہے، کہیں انسانی رشتوں کی ضرورت کا خیال ہے۔ کہیں انسان کی کمزوریاں ہیں، کہیں اس کی خامیاں ہیں، ہمیں اس کی بے راہ روی ہے، کہیں بدعنوانی ہے، کہیں اس کی بے بسی ہے، مجبوری ہے۔ غرض انسانی زندگی کے مختلف روپ منٹو نے اپنے افسانوں ہی میں پیش کیے ہیں۔

منٹو کا سب سے بڑا مسلک انسان دوستی تھا۔ ان کے یہاں مصلحت اندیشی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ مذہب، دین، دھرم کے نعروں کے پس پشت محض مذہبی منافرت، تعصب اور تنگ نظری چھپی ہوئی ہے اور مفاد پرستوں نے اسے محض ایک آڑ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ ان مکاریوں اور جعل سازیوں کا قلع قمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنی کہانی ''سہائے'' میں انھوں نے اپنا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان

مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمان یہ سمجھے ہوں گے کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا۔ مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب، دین، دھرم، ایمان، یقین، عقیدت جو کچھ بھی ہے، ہمارے جسم میں نہیں ہماری روح میں ہوتا ہے۔ چھرے، چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہو سکتا۔

منٹو اپنی انسان دوستی اور حق گوئی کی وجہ سے ہی منفرد اور عظیم فنکار ہیں۔ ان کے افسانوں اور نظریات سے آپ لاکھ اختلاف کریں یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں سماجی ذہنی اور فکری زندگی کی عکاسی کی ہے اور انسان سماج میں رستے ہوئے ناسوروں پر نشتر رکھ دیے ہیں۔ وہ مسخ شدہ کرداروں اور انسانی زندگی سے متعلق بے شمار موضوعات کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ انھوں نے اپنے موضوعات کو جس نئی ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا وہ ایک الگ کارنامہ ہے۔ مگر انسان اور انسانیت کے گرد گھومتے ہوئے بھی منٹو کا فن پروپگنڈے اور صحافت کا فن نہیں۔ یہ بات اس لیے بھی مستحسن ہے کہ منٹو کا عہد ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دور میں کسان، مزدور، طبقہ داری، نابرابری، سرخ سویرا، پرولتاری انقلاب اور اس قبیل کے موضوعات کے گرد کہانیاں گھومتی تھیں۔ منٹو نے اس راستے پر چل کر اپنا ایک علاحدہ راستہ تراش لیا اور موضوعات میں وسعت پیدا کر کے اپنی نئی شناخت پیدا کی۔ ان کے موضوعات میں موجود تنوع اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نوجوان ناقد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے لکھا ہے:

> ''منٹو کے افسانوں میں جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ کھینچتی ہے وہ ہے موضوعات کا تنوع۔ منٹو نے زندگی کے ہر اس پہلو کو اپنا موضوع بنا لیا ہے جس کی نقاب کشائی انھیں ایک اہم فرض کی طرح ضروری محسوس ہوئی۔ مزدور، طوائف، کلرک، رند خرابات اور زاہد پاکباز سب کی الجھنیں، مسائل اور ان کا روحانی کرب اور ان سب سے بڑھ کر

> جنس اور اس کے گوناگوں مظاہر منٹو کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ انھوں نے طبقاتی نظام کے نتیجے میں نچلے طبقے کے لوگوں کے ذہنی، جنسی اور نفسیاتی مسائل پر قلم اٹھایا ہے خاص کر سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کی جو جسم فروشی پر مجبور ہے، بے بسی، پستی اور افلاس کی دہلا دینے والی تصویریں پیش کیں۔ فرسودہ اور از کار رفتہ عقائد و تصورات یا ذہنی رویوں پر انھوں نے کاری وار کیا ہے اور مذہب و اخلاق کے ٹھیکیداروں سے سیدھی ٹکر لی ہے۔[1]''

دراصل اخلاق و شرافت کا جو معیار سماج کے یہاں برسوں سے قائم ہے منٹو کی نظر میں وہ بالکل کھوکھلا ہے۔ وہ اس سماج کا ننگا پن، اس کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کے افسانے نہ سیاسی پروپگنڈا ہیں نہ صحافتی۔ انھوں نے انسانی نفسیات کا مطالعہ کیا۔ انسان کی فطری جبلت کیا ہے؟ مختلف حالات میں انسان کا ردعمل کیسا ہوتا ہے؟ متضاد حالات میں وہ کون سا عمل کرتا ہے؟ ان صورتوں کو انھوں نے جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ خواہ وہ ایک طوائف کی فطرت کا مطالعہ ہو، سماج کے غلط روّیے کا جائزہ ہو یا فسادات کے تحت کسی انسان کی اندرونی کیفیات کا مشاہدہ ہو۔ ہر جگہ وہ فنی چابکدستی سے ایک جراح کی طرح زخم کو نشتر لگاتے ہیں اور قاری خود بخود یہ محسوس کرتا ہے کہ اس زخم کا مداوا ضروری ہے۔ ورنہ یہ زخم ناسور بن جائے گا۔

منٹو نے ہر موضوع پر افسانے لکھے ہیں، خواہ وہ جنسی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا انقلابی، تقسیم ہو یا ہجرت۔ انھوں نے ہر موضوع کے ساتھ انصاف کیا منٹو انسان کو کبھی بھی اس کے سماجی روابط سے الگ کر کے نہیں دیکھتے جو عام طور پر جرائم کی کہانیوں اور جنسی بے راہ روی کے شکار تنہا فرد پر مشتمل کہانیوں کا ذخیرہ ہے۔ منٹو کے افسانوں میں لوگوں کی ریل پیل ہے، سڑکیں کوٹھے اور بازار ہیں، گھر اور آنگن کی چہل پہل ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، نکڑ اور چوراہے کی گہما گہمی ہے۔ سیاسی جلوس، دنگے اور فسادات ہیں، کرداروں کے طبقاتی، سماجی،

---

[1] خدا بخش جرنل ۱۳۵

مذہبی اور پیشہ ورانہ مشاغل ہیں۔ منٹو انسانی زندگی کا مطالعہ ہمیشہ اس کے مخصوص طبقاتی اور سماجی پسِ منظر میں کرتے ہیں ان کی فضا بندی، مرقع سازی اور جزئیات نگاری میں کرداروں کے مخصوص ماحول و فضا کی پوری نقش گری ملتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں مواد اور فن دونوں گھل مل جاتے ہیں۔ سفاک حقیقت نگاری، کرداروں کے ظاہر اور باطن کی نقاب کشائی، تعفن اور غلاظت کی پردہ دری اور قلب انسانی میں جھانک کر اس کی مسرّتوں اور الم ناکیوں کے ابدی سرچشموں کی تلاش، ان کے فن کے امتیازات ٹھہرے۔ جنسی سچائیاں ان کے دامن سے اس طرح لپٹیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کا حوالہ بن گئے۔ فنی اور تکنیکی تجربوں کے ساتھ انھوں نے افسانوی فن کی حرمت بھی بحال رکھی۔ یہی سب ہے کہ ان کی کہانیاں دل میں پیوست ہو جاتی ہیں۔

منٹو کو محض جنس نگار کہنا منٹو کی توہین ہے۔ منٹو عورت کے خارجی کوائف کے نہیں اس کے داخلی منظرنامے کے فن کار ہیں۔ ان کا بنیادی مسئلہ جنس نہیں بلکہ زندگی کا الم، عورت کا دکھ اور اس کی روح کی تنہائی ہے۔ ایسے مقامات پر منٹو کے یہاں جو گہری دردمندی ملتی ہے وہ ممتا اور ''کرونا'' کی انتہائی ارفع اور بالیدہ کیفیت سے شناخت کی جا سکتی ہے۔ منٹو جنسی مسائل کو اس لیے نہیں پیش کرتے کہ ان سے خود لطف اندوز ہوں یا قاری کو سستی لذت بہم پہنچائیں۔ سماج میں جو غلاظت انھیں نظر آتی ہے وہ اسے دور کرنا چاہتے ہیں۔ غلاظت کے سلسلے میں دو رویے ممکن ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس پر خاک ڈال دی جائے، غلاظت چھپی رہے گی۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ اسے دیکھو، دوسروں کو دکھاؤ اور اس کے خلاف نفرت پیدا کرو۔ اس کا خاتمہ اس طرح ممکن ہے۔ منٹو نے یہی طریق کار اختیار کیا۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں جو ننگا پن ہے وہ ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ سماج میں پہلے سے موجود ہے۔ منٹو جب اس سماج کی تصویر کھینچتے ہی تو اس ننگے پن کو کیسے چھپا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو نے خود لکھا تھا:

> ''زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں، یہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میری

تحریر میں قطعی نقص نہیں"، گویا طوائفوں اور جنس کے بارے میں منٹو جو کچھ لکھتے ہیں دراصل ان کی نفسیات کے دائرے میں ہوتا ہے۔ پھر اس نفسیات کی تشکیل میں سماج کا کیا رول ہوتا ہے اس پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے۔ ممتاز ناقد وارث علوی نے اسی نکتے کو نظر میں رکھتے ہوئے منٹو کی اس روش پر تبصرہ کیا ہے کہ

> "جنس کی کارفرمائی منٹو کے بیشتر افسانوں میں نظر آتی ہے لیکن اس میں جنس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ کرداروں کی شخصیت کے دوسرے پہلو بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے نیک و بد انجام میں دوسرے جذبات بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً طوائفوں پر اس کی جتنی کہانیاں ہیں، ہم انہیں جنسی کہانیاں نہیں کہہ سکتے حالانکہ جنس طوائف کی زندگی اور کردار کا حاوی جزو اور اس کا پیشہ ہے۔ لیکن ان افسانوں کے مرکز میں یا تو ماتا کا جذبہ ہے، یا بے بسی اور تنہائی کا، یا بے لوث خدمت گزاری کا، یا پھر طوائف کے کردار کے ایسے پہلوؤں کی آئینہ داری ہے جو اس کی انسانیت اور نسائیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ان افسانوں میں دلچسپی کا مرکز جنس نہیں بلکہ دوسرے نفسیاتی اور اخلاقی عوامل ہیں" ("منٹو ایک مطالعہ" ص ۶۷)

یعنی منٹو کے یہاں طوائف کوئی ایسی خلقت نہیں جو آسمانوں سے اتر کر سیدھے کوٹھوں پر چلی گئی ہو بلکہ اس کی ایک عقبی زمین ہوتی ہے اور اس عقبی زمین میں طوائف ہونا، طوائف بننا اور طوائف کی طرح جیتے ہوئے سماج سے ایک مخصوص رابطہ رکھنا، اس کا مقدر ہوتا ہے۔ لہٰذا منٹو کو طوائف سے متعلق کوئی افسانہ بھی ایک تنہا واردات کی طرح نہیں پڑھا جا سکتا۔ اس لیے منٹو کو جنسی ترغیبات کا افسانہ نگار کہنا یا اس کے افسانے کو جنسی اشتعال کی رپورٹ سمجھنا منٹو کا انتہائی غلط مطالعہ ہے۔

منٹو کے افسانوں میں جو حقیقت نگاری ہے اس میں نشتریت اور تیکھے پن کو واضح طور پر محسوس کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس وقت خاص طور سے پیدا ہوتی ہے وہ انسانی

زندگی کے حدود جو تاریک پہلوؤں (مثلاً طوائفوں) کی پردہ دری کرتے ہیں۔ جب وہ انسانیت کے جسم پر سڑتے ہوئے زخموں کو بڑی بے رحمی سے کریدتے ہیں تاکہ افراد کو ان زخموں کی اصلی حالت کا اندازہ ہو۔ طوائفوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے افسانوں میں انھوں نے ان حقیقتوں کو واضح کیا ہے کہ طوائف انسانی زندگی کے خوشنما چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ ایک ایسا ناسور ہے جو سالہا سال سے رِس رہا ہے۔ اس ناسور کو دکھاتے ہوئے منٹو نے طوائف کو ایک انسانی مخلوق کی طرح دیکھا ہے اس لیے وہ اس کی مسرّتوں اس کے غموں، اس کی مسرتوں، اس کی ناکامیوں اور اس کی مایوسیوں کے تمام پہلوؤں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ایسے افسانوں کو پڑھ کر طوائف سے ہمدردی اور غلط نظام اقدار سے گھن اور نفرت کا احساس ہوتا ہے اور یہیں سے منٹو کی کامیابی کی حد شروع ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ منٹو کے یہاں جنسی پہلوؤں کو پیش کرنے کا مقصد جسم و جمال سے لذت کا حصول نہیں بلکہ داخلی حقیقتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ منٹو قحبہ خانوں کی کسبیوں کا ذکر کرتے ہوئے اکثر و بیشتر ان کے جسم سے ہٹ کر ان کی روح کا نظارہ کرتے ہیں۔ ان کے قحبہ خانوں میں عورت معاشرتی سطح پر استحصالی عناصر کے ہاتھوں بے چارگی کی تصویر بن گئی ہے۔ وہ بے بسی، تنہائی اور اجنبیت کی اس صورت حال کی غمازی کرتی ہے جو آفرینش سے لے کر آج کے مشینی دور تک عورت کا مقدر رہی ہے۔ انھی بے بس روحوں کی ویرانی، سونے پن اور کرب کو منٹو منظر عام پر لاتے ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں منٹو کا کہنا ہے:

> ''عورتوں میں ننانوے فیصد ایسی ہوں گی جن کے دل عصمت فروشی کی تاریک تجارت کے باوجود بدکار مردوں کے دل کی بہ نسبت کہیں زیادہ روشن ہوں گے۔ بادی النظر میں عصمت باختہ عورتوں کا مذہب سے لگاؤ ایک ڈھونگ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ ان کی روح کا وہ حصہ پیش کرتا ہے جو سماج کے زنگ سے یہ عورتیں بچا کر رکھتی ہیں ...... جسم داغا جاسکتا ہے مگر روح نہیں داغی جاسکتی''۔ (عصمت فروشی)

منٹو نے بار بار اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ہر عورت ویشیا نہیں ہوتی مگر ہر ویشیا

ایسے پہلوؤں کی آئینہ داری ہے جو اس کی انسانیت اور نسائیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ان کے بعض افسانے مثلاً دس روپے، بابو گوپی ناتھ، سرکنڈوں کے پیچھے، شانتی، چمک، جانکی، ممی، کالی شلوار اور خوشیا وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن کی طوائفیں بنیادی طور پر عورتیں ہی ہیں یعنی اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ لیکن ان کے ساتھ جس قسم کے واقعات و حادثات پیش آتے ہیں وہ ان کی قسمت متعین کرتے ہیں۔ دیکھیے کس طرح افسانہ ''دس روپے'' کی ہیروئن سرتیا اپنی معصومیت کو تج دینے پر مجبور ہے۔ جان بوجھ کر نہیں حالات کے دباؤ میں اس کی تمام تر معصومیت قربان گاہ پر چڑھ جاتی ہے۔ اس کا جنسی جذبہ مقررہ عمر سے پہلے ہی ایک ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے، ایسی حالت میں معصوم لڑکی پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب جارجٹ کی ساڑی پہنتی ہے، لپ اسٹک لگاتی ہے اور ایک نہیں متعدد جوانوں کے ساتھ داد عیش دیتی ہے، جس کے صلے میں اسے دس روپے ملتے ہیں لیکن یہ دس روپے کا حصول کسی طے شدہ پیشے کے اختیار کرنے کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی نفسیاتی گرہ ہے جو اس کے جذبات کو اس طرح بھڑکا دیتی ہے کہ وہ اسے قابو میں نہیں رکھتی، رکھ بھی نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ اس پر جسمانی دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس کو نگل نہیں سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح افسانہ ''سرکنڈوں کے پیچھے'' میں بھی نواب ایک الھڑ اور معصوم بچی سے فاحشہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ مقدس رشتہ کیا ہوتا ہے اور گھریلو زندگی کے کیا آداب ہیں؟ چنانچہ اسے تو صرف اپنے پیشے میں کوئی برائی نہیں نظر آتی ہے تو قصور اس سماج کا ہے جس نے وہ حالات پیدا کیے کہ اس کی سوچ کا سانچہ بدل گیا ہے۔

افسانہ ''خوشیا'' بھی طوائفوں کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔ کانتا پیشہ کرتی تھی اور خوشیا اس کا دلال تھا — ایک دن خوشیا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے کانتا کی کھولی میں داخل ہو کر اسے بالکل برہنہ دیکھا۔ وہ اس پر گھبرایا لیکن کانتا نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور یہ کہہ کر اس کی حیرت کو دور کرنے کی کوشش کی کہ جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے اپنا ہی خوشیا ہی تو ہے، آنے دو ......'' اس بات نے خوشیا کی

حیرت کو تو کسی حد تک دور کر دیا لیکن اس فقرے میں اس نے بہت سے مطلب کریدنے شروع کر دیے لیکن وہ کسی خاص مطلب تک نہ پہنچ سکا اور اس کو الجھن سی رہی۔ دس برس کی دلالی کے عرصے میں وہ ایسے واقعے سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اس ننگی عورت کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہو۔ اس کے جذبات میں ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور کانتا کے جسم کے خطوط نے اس کے دل میں اس خیال کو بیدار کیا تھا کہ کانتا دس روپے میں مہنگی نہیں ہے۔ انھی خیالات میں محو وہ گھر پہنچا اور اپنے آپ کو خوب سجایا بنایا، نئی دھوتی پہنی، بالوں میں کنگھی کی، داڑھی منڈوائی اور پھر ایک ٹیکسی لی۔ ٹیکسی لے کر وہ ایک اور دلال کے ساتھ کانتا کے گھر پہنچا۔ دلال معاملہ طے کر کے کانتا کو ٹیکسی میں لے آیا۔ اور جب وہ ٹیکسی میں داخل ہوئی تو سامنے خوشیا کو دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے کہا ''خوشیا تم'' — خوشیا نے جواب دیا ''ہاں میں — لیکن تمھیں روپے مل گئے ہیں نا؟'' — خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی ''دیکھو ڈرائیور! جوہو لے چلو''۔ اس واقعے کے بعد خوشیا پھر اس بازار میں نظر نہ آیا — اس افسانے میں منٹو نے عورت کے بجائے ایک مرد کی نفسیات اور اس کے جذبات کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جذبات، نفسیات اور حقائق صرف عورتوں کے ہی نہیں مردوں کی زندگی سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ مرد بھی ہر حال میں مرد ہوتا ہے، دلال تک اس سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ خوشیا کے کردار میں منٹو نے ایک ایسے مرد کو دکھایا ہے جس کے جذبات دس سال کی دلالی کے بعد بھی سرد نہیں ہوتے۔ زندگی کی اس بنیادی حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ اس افسانے کا ذکر درمیان میں صرف اس لیے کیا گیا منٹو پر یہ الزام نہ لگایا جائے کہ اس نے صرف عورتوں اور طوائفوں کی نفسیات اور ان کی معصومیت کو دیکھا ہے اور اس دنیا سے وابستہ دوسرے افراد پر نگاہ ہی نہیں ڈالی۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ منٹو کی نظر میں قحبہ خانوں کی عورتیں زیادہ رہی ہیں دوسرے افراد کم، مگر خوشیا جیسے چند افسانے بھی ہیں جن میں منٹو نے دلالوں اور گراہکوں کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آیئے ذیل میں پھر نسوانی کرداروں کی طرف واپس چلتے ہیں۔

افسانہ ''شانتی'' بھی ایک طوائف کی بدسلیقگی اور پھوہڑپن کو بڑے سلیقے سے

پیش کرتا ہے۔ دراصل ''شانتی'' نام کا یہ کردار ابتدائی مرحلے میں ایک طرح کی لاتعلقی اور بے حسی کا شکار ہے۔ یہ لاتعلقی اور بے حسی اسے محض بے جان گوشت سے گوشت پوست میں مبدّل کر دیتی ہے اور یہ اپنے گاہکوں سے اس طرح ملتی ہے جیسے وہ مشینی طور پر کوئی کام انجام دے رہی ہے جس میں گرم جوشی عنقا ہوتی ہے۔ یہ انتہائی ٹھنڈی عورت کی طرح سامنے آتی ہے جس کے مزاج کا چڑچڑا پن اسے اور بھی کریہہ بنا دیتا ہے۔ جسم کا لین دین اتنا کاروباری اور ٹھس معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی انسانی سرشت کا شائبہ موجود نہیں۔ تو کیا واقعی شانتی ایک مردہ عورت ہے، ایک مردہ شئے ہے جو ایک مشینی زندگی گزارتی رہے گی اور اسی طرح مر جائے گی۔ جواب نفی میں ہے۔ نہیں ان حالات میں بھی عورت زندہ ہے اور جب اسے ایک شخص کی طرف سے محبت کا کیف حاصل ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ تپنے لگتی ہے اور پگھل بھی جاتی ہے اور پھر باضابطہ سراج نام کے اس شخص کو اپنا بھی لیتی ہے۔ کردار کا ایسا قلب ماہیت (Transformation) بادی النظر میں غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچائی تو یہ ہے کہ جب حالات بدلتے ہیں تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ذہن و دماغ میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ کردار نئی آب و تاب اختیار کر لیتا ہے۔ بقول پروفیسر وہاب اشرفی:

> ''منٹو کا کمال یہ ہے کہ وہ برف میں آگ پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ آگ جلانے کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص پیکر میں ڈھالنے کے لیے، پگھلانے کے لئے ہوتی ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے منٹو عورت کی Instinct کو بدلنا نہیں چاہتا۔ گویا عورت کی عورتیت (نسائیت) کو باقی رکھتا ہے۔ (معنیٰ کی جبلت)

اس کے برعکس افسانہ ''جانکی'' کی جانکی ایک دوسرے قسم کی طوائف ہے جس کو ایثار و قربانی سے پرہیز ہے۔ خدمت کو اپنا حقیقی شعار بنا لیتی ہے۔ چاہتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ خلوص و محبت کی آماجگاہ بنی رہے۔ ٹوٹ کر محبت کرنا اس کا فریضہ ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ اس کو استعمال کرنے والے ایک طرح سے اس کی نفی ہیں۔ اسکا پہلا تعلق عزیز سے ہوا تھا۔ وہ عزیز کو کسی مرحلے میں بھولتی نہیں ہے اور ہر موقعے پر اسے یاد کیے جاتی ہے۔ لیکن جب

وہ سعید کی طرف راغب ہوتی ہے تو پھر اس کے ساتھ بھی یکساں سلوک کرتی ہے لیکن اس کے نہاں خانۂ دل سے عزیز غائب نہیں ہوا ہے۔ ایک موقعے پر عزیز اسے بلاتا ہے تو بخار کی وجہ سے پہنچ نہیں پاتی، عزیز تو مرد ہے غصے پر قابو نہیں پا سکتا۔ وہ اسی حالت میں جانکی کو نکال دیتا ہے لیکن اسے نارائن جیسا شخص مل جاتا ہے۔ جو اس کے لیے دوائیں چراتا ہے، انجکشن لگواتا ہے اور جب ٹھیک ہو جاتی ہے تو وہ اسے عزیز اور سعید کی محبتوں کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ گویا نارائن فی الحال اس کا آخری پڑاؤ ہے۔ یہاں بھی منٹو نے جانکی کو جذبۂ ایثار سے سرشار رکھا ہے۔ نارائن کو قبول کرنے میں یہ احساس کارفرما ہے کہ اس نے کٹھن وقت میں اس کی مدد کی ہے، علاج کروایا ہے۔ ظاہر ہے وہ اسے بھول نہیں سکتی۔ جانکی ایک طوائف کی طرح ضرور ہے مگر یہ نہ پہلے پیشہ ور تھی نہ اب ہے۔ پیشاور سے بمبئی تک جو بھی مرد اس کے سامنے آئے ہیں، جنھوں نے پیش قدمی کی ہے، وہ ان کے سامنے بچھ ضرور جاتی ہے لیکن تقاضائے الفت کے تحت نہ کہ کسی پیشے کے واسطے یا مکاری کی خاطر — یہ ہے منٹو کی طوائف یا دوسری طوائفیں جو منٹو کے یہاں ایک خاص آئینے میں دیکھی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ منٹو جنس کے لیے ایسے موضوعات اپنا لیتا ہے یا لذت کشید کرتا ہے، انتہائی غلط اور لایعنی الزام ہے۔

منٹو کی ایک اور کہانی 'پہچان' بھی طوائفوں سے متعلق ہے لیکن اس میں ایسی طوائفوں کا ذکر ہے جو بازار میں نہیں اپنے گھروں میں پیشے کرتی ہیں۔ منٹو نے ان پیشے ور عورتوں کی زندگی کی ساری زبوں حالی اور ان کے سارے کرب کو اس افسانے میں مجسم کر دیا ہے۔ چار دوست شراب سے سرشار ہو کر یوں تو تفریح کی غرض سے عورت کی تلاش میں نکلتے ہیں لیکن چار جگہ جانے کے بعد بھی انھیں تفریح کی جگہ تنغض حاصل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تانگے والا انھیں ”میموں“ کے یہاں لے جاتا ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں کمرے میں گھپ اندھیرا تھا — اور جہاں انھیں دو کالی بھجنگ انتہائی بدصورت عورتیں نظر آئیں اور جن کو دیکھ کر ان دوستوں میں سے ایک نے کہا ”کیا لذیذ ٹافیاں ہیں“۔ یہ بات سن کر میموں میں سے ایک جس کا سیاہ چہرہ سرخی لگانے کے باعث زیادہ پکی ہوئی اینٹ کی سی رنگت اختیار کر گیا تھا، ہنسی — یہ لوگ بھی ہنس دیے — اور ان دوستوں میں سے ایک نے پوچھا ”کیا

نام ہے آپ کا؟ بول ''لوسی'' — دوسرے دوست نے آگے بڑھ کر پوچھا — ''آپ کا''؟

اس نے جواب دیا ''میری''۔

تیسرا بھی آگے بڑھا ''کیوں صاحب آپ کیا کام کرتی ہیں؟''

دونوں لجا گئیں — ایک نے ادا سے کہا — ''کیسا بات کرتا ہے تم؟''

دوسری نے کہا 'چلو جلدی کرو — رہنا مانگتا ہے یا نہیں — ہمیں روٹی پکانا ہے۔'

اور ان لوگوں نے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو وہ گیلے آٹے سے بھرے ہوئے اور وہ اس کی مروڑیاں بنا رہی تھی — تانگے والا قطعی طور پر غلط سمجھ کر انھیں یہاں لے آیا تھا۔ مروڑیاں اس عورت کے ہاتھوں سے کچے فرش پر گر رہی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اناج رو رہا ہے اور یہ مروڑیاں اس کے آنسو ہیں۔ اس منظر سے تنگ آ کر وہ لوگ وہاں سے چل دیے اور اس کے بعد تانگے والا انھیں ایک پنجابن گلزار کے یہاں لے گیا جو بڑی ہی خوفناک عورت تھی۔ وہاں سے یہ لوگ الٹے پاؤں واپس ہوئے اور پھر انھیں تانگے والا ایک میلے کچیلے گھر میں لے گیا جہاں ایک بڑھیا چولھا جھونک رہی تھی — یہ سب اس مکان میں اندر جا کر بیٹھ گئے اور وہاں انھیں ایک ٹھگنی سی کم عمر لڑکی نظر آئی۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ بدن کی ساخت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی تیزی سے چلی ہوئی گاڑی ہے جو اب ایک دم رُک گئی ہے۔ اس کے پہیوں میں بریک لگ گئے ہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اس کا سارا رنگ و روغن دھوپ اور بارش میں اڑ گیا ہے۔ اس عمر میں بھدی سے بھدی لڑکی کے جسم میں جو ایک قسم کی شوخ جاذبیت ہوتی ہے، اس میں بالکل نہیں تھی — کپڑوں کے باوجود وہ ننگی دکھائی دیتی تھی — بہت ہی بے ہودہ اور ناواجب طریقے پر ننگی — اس کے جسم کا نچلا حصہ قطعی طور پر غیر نسوانی تھا۔ یہاں سے بھی یہ لوگ جان چھڑا کے بھاگے۔ تانگے والے نے یہی کہا ''بابو جی آپ کو پہچان نہیں'' — اور یہ کہہ کر اس نے کرایے کے روپے جیب میں ڈالے اور — 'ساون کے نظارے' گاتا ہوا چلا گیا۔ اس افسانے میں زندگی کے متضاد پہلوؤں کو دکھا کر منٹو نے طوائفوں کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ ایک طرف تفریح اور عیاشی کا خیال اور اس کی تلاش و جستجو ہے لیکن اس کا حصول بے معنی ہے کیونکہ جس ماحول میں اس کو تلاش کیا جا رہا

ہے، اس میں ایک کرب کی سی کیفیت ہے۔ جہاں بھی یہ لوگ پہنچتے ہیں وہاں منٹو کی نظریں گندگی اور تاریکی کو دیکھتی ہیں۔ لالٹینوں کی اندھی روشنی میں بڑی مشکل سے انھیں راستہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی ہر جگہ آٹا گندھا ہوا اور روٹی پکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ اسی کے لیے یہ سارا کاروبار چلتا ہے۔ منٹو اسی حقیقت اور اسی کرب کو دکھانا چاہتا ہے جس کے پس منظر میں ان عورتوں کی مجبوریاں اور سسکیاں چھپی ہوئی ہیں۔

منٹو نے تقریباً ۲۷۰ افسانے لکھے ہیں اور ان میں بڑی تعداد عورتوں اور طوائفوں کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ان تمام افسانوں کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں منٹو کے فکر ونظر کی وہ باتیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہیں جو عورت، مرد اور جنس کے حوالے سے سامنے آتی ہیں۔ اس قبیل کے بعض افسانے بے حد مشہور ہیں جن پر اکثر وبیشتر گفتگو ہوتی رہی ہے۔ ایسے تمام افسانوں کے مطالعے سے منٹو کا عورتوں کے سروکار کی فنی صورت سامنے آتی ہے۔

منٹو کا سب سے بڑا موضوع ‘‘انسانی زندگی’’ ہے۔ انھوں نے اپنے معاشرے میں سانس لینے والے ہر طبقے اور ہر طرح کے افسانوں کی رنگارنگ زندگیوں کو ان کی نفسیاتی اور جذباتی تہہ داریوں سمیت اپنے افسانوں کے کینوس پر منتقل کیا ہے۔ اپنے اردگرد کے انسانی بالخصوص عورتوں اور طوائفوں کے جسمانی استحصال اور روحانی حال کے تئیں تمام تر انسانی ہمدردی کو جگا کر رکھ دینا منٹو کا کمال ہے۔ ہتک، سڑک کے کنارے، ٹھنڈا گوشت، سو کینڈل پاور کا بلب، خوشیا، کالی شلوار، پھندنے اور ممی جیسے افسانے منٹو کے فنی معراج کا عکس وآئینہ ہیں۔ عورت کے اپنے جسمانی اور معاشی استحصال کو خاموشی سے برداشت کرتے رہنا اور ایک جھٹکے میں اپنے روحانی قتل پر بیدار ہو کر بپھر اٹھنے کی کہانی ہے۔ ‘‘ہتک’’ ‘‘سڑک کے کنارے’’ والی عورت کی ایک خاص لمحے میں خود سپردگی اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والی بچی کے متعلق نفسیاتی فشار کا تیز وتند سیلاب، ‘‘ٹھنڈا گوشت’’ والے ایشر سنگھ کے گناہ کا اس کی مردانہ حس کو نامردی میں تبدیل کر دینے والے ٹھنڈے احساس کا بوجھ اور ‘‘خوشیا’’ دلال کا اپنی جبلت کے زیر اثر دلال سے گاہک بن جانے والے فطری واقعہ کو افسانوی شکل میں قلم بند کرنا منٹو کا عظیم کارنامہ ہے۔ منٹو نے سماج میں جو خرابیاں،

بدعنوانیاں، بے اعتدالیاں دیکھیں انھیں کھلے لفظوں میں منکشف کر دیا اور یہی ان سے نجات پانے کی صورت تھی۔ ٹھنڈا گوشت، کھول دو، موذیل، بو، کالی شلوار، دھواں، اللہ دتا، دس روپے، اوپر نیچے درمیان، ہتک، شاوان بلاوز، پھاہا، خورشٹ، راجو، ممد بھائی، نطفہ، میرا نام رادھا ہے، کی برہنگی اور بے باکی کی خوب چرچا رہی۔ ان میں سے کچھ پر فحاشی کے الزام میں مقدمے بھی چلے۔ پڑھنے والے ایسے افسانوں کی نفسیات اور ان میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر سکے، ایسے افسانوں کو جنسی اور فحش افسانے کہنا غلط ہے کیونکہ ان کے مرکز میں یا تو ممتا کا جذبہ ہے یا بے بسی اور تنہائی کا، یا بے لوث خدمت گزاری کا یا پھر طوائف کے کردار کے ایسے پہلوؤں کی آئینہ داری کا جو انسانیت اور نسائیت کو اجاگر کرتا ہے۔

ان افسانوں میں طوائف کے ذکر کے ساتھ کسی قسم کی لذت، کسی طرح کی جنسی تسکین یا جسمانی آسودگی کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔ اسی لیے طوائف میں منٹو کے یہاں دلچسپی کا سامان باقی نہیں رہتی اور برخلاف اس کے انسانیت کے جسم پر ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ منٹو طوائف کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں طوائف کی زندگی سے متعلق تاریک پہلو نسبتاً زیادہ نظر آتے ہیں۔ منٹو ان پہلوؤں کی وضاحت بہت تفصیل سے کرتے ہیں۔ یہ تفصیل ایک طرف تو گھن کا احساس پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف اس سے ہمدردی کا خیال بیدار ہوتا ہے۔ گھن تو اس ماحول سے پیدا ہوتی ہے جس میں گندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور ہمدردی کے خیال کو وہ حسرتیں اور مایوسیاں بیدار کرتی ہیں جن کا اس ماحول کے افراد کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا ہے۔ منٹو کی حقیقت میں نگاہیں یہ دیکھتی ہیں کہ طوائف پیٹ کی خاطر انسانیت کی سطح سے نیچے گرنے کے باوجود اپنا پیٹ نہیں پال سکتی۔ اس کی زندگی معاشی بدحالی میں گزرتی ہے۔ اسے ساری زندگی جذباتی ناآسودگی کے عالم میں رہنا پڑتا ہے۔ "ہتک کی سوگندھی"، "خوشیا کی کانتا اور" کالی شلوار کی سلطانہ، سب معاشی اعتبار سے بدحال اور جذباتی اعتبار سے ناآسودہ ہیں۔ منٹو نے ایسی طوائفوں کی نفسیات کے ہر پہلو کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے، اور جس ماحول میں یہ زندگی بسر کرتی ہیں اس ماحول کی بڑی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں۔ منٹو جب ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں

تو گویا ایک غلط سماجی نظام اقدار کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جس نے صدیوں سے طوائفوں کو باقی رکھا ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

> ''منٹو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا لیکن جن حالات کی تصویر کشی کرتا ہے ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ منٹو اس غلط سماجی نظام کا جانی دشمن ہے۔ وہ اس نظام اقدار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کوئی واضح لائحۂ عمل پیش نہیں کرتا اس کے خلاف نفرت کے جذبات کو ضرور ابھار دیتا ہے۔ لیکن یہ نفرت محض نفرت نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کی حدیں انسانی ہمدردی سے ملی ہوتی ہیں۔ طوائف کے ماحول اور اس کے معاملات و مسائل کو پیش کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا عنصر منٹو کے یہاں ہر جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے'' (منٹو کی حقیقت نگاری)

منٹو نے صرف طوائفوں یا حرمات کو ہی موضوع نہیں بنایا۔ ان کی نگاہ میں دوسری قماش کی عورتیں بھی رہی ہیں۔ عورت کے تو کئی روپ ہیں۔ سب سے اہم ممتا کا روپ ہے۔ ظاہر ہے منٹو اس کو نہیں بھول سکتے تھے۔ ان کے یہاں عورتوں کے احترام کا جو التزام ہے وہ ان کی ماں کے واسطے سے ہے۔ لہٰذا ممتا کو ایک بڑی اور امتیازی جگہ انھوں نے دی ہے۔ ایسے متعدد افسانوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً شاہ دولے کا چوہا، خدا کی قسم، ممی، سڑک کے کنارے، سلمٰی اور اولاد وغیرہ۔

عورتوں کے علاوہ منٹو نے فسادات، تقسیم وطن اور انسانوں کی رنگا رنگ زندگی کو موضوع بنایا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی شناخت عورت اور فسادات پر لکھے گئے افسانوں کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ موضوع انتخاب میں شدت پسند ہونے کے باوجود موضوع کو اظہار میں منتقل کرتے وقت حد درجہ باشعور اور متوازن فنکار ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک خاص باغیانہ، بے باکانہ اور جرأت مندانہ طرز کی بنیاد ڈالی ہے۔ منٹو نے ایسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی جو اس سے قبل اردو افسانے کی حدود میں شامل نہیں تھے۔ انھوں نے ممنوعہ پردوں کے پیچھے

کے کوائف کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ بقول وارث علوی:

> ''منٹو کی بے لاگ اور سفاک حقیقت نگاری نے بے شمار عقائد، مسلمات اور تصورات کو توڑا اور ہمیشہ شعلۂ حیات کو برہنہ انگلیوں سے چھونے کی جرأت کی۔ منٹو کے ذریعے ہم پہلی بار ان حقائق سے آشنا ہوتے جن کا صحیح علم نہ ہو تو آدمی نرم و نازک اور آرام دہ عقاید کی محفوظ تحویل میں چھوٹی موٹی شخصیتوں کی طرح جیتا ہے'' (منٹو کا مطالعہ)

سچ ہے کہ منٹو نے اپنے معاشرے میں سانس لینے والے ہر طبقے اور ہر طرح کے انسانوں کی رنگا رنگ زندگیوں کو، ان کی نفسیاتی اور جذباتی تہہ داریوں سمیت اپنے افسانوں کے کینوس پر منتقل کیا۔ منٹو نے خیالی کرداروں کے بجائے ہمیشہ حقیقی کرداروں کو افسانوں میں پیش کیا اور ان کرداروں کے توسط سے سوسائٹی کے مکروہ چہرے کی رونمائی کی۔ اپنے اردگرد کے انسان اور ماحول کو انھوں نے بہت باریکی سے دیکھا تھا۔ ان کی خوشیوں، غموں اور مسئلوں کو محسوس کیا تھا۔ مزدور، صحافی، کلرک، طوائف، رندِ خرابات اور زاہد پاکباز، سب کی الجھنیں، مسائل اور ان کا روحانی کرب ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ منٹو کے بیشتر کردار ہمارے معاشرے کے مسترد لوگ ہیں جو ہر روز نوکری کے اشتہاروں کے ساتھ اپنی تعلیمی قابلیت کا قد ناپتے ہیں۔ جو وقت کے مکتب میں بھوک بیماری، بے بسی، ذلت، محرومی، مایوسی، استحصال، جبر اور غلامی کے، ہجے یاد کرتے ہیں۔

منٹو نے ہر موضوع پر افسانے لکھے۔ خواہ وہ جنسی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا انقلابی تقسیم ہو یا ہجرت، ہر موضوع کے ساتھ انھوں نے انصاف کیا ہے۔ منٹو انسان کو کبھی بھی اس کے سماجی روابط سے الگ کر کے نہیں دیکھتے جو عام طور پر جرائم کی کہانیوں اور جنسی بے راہ روی کے شکار تنہا فرد پر مشتمل کہانیوں کا وطیرہ ہے۔ منٹو کے افسانوں میں لوگوں کی ریل پیل ہے۔ سڑکیں، کوٹھے اور بازار ہیں، گھر اور آنگن کی چہل پہل ہے، شادی کے ہنگامے ہیں، نکڑ اور چوراہوں کی گہما گہمی ہے، سیاسی جلوس، دنگے اور فسادات ہیں، کرداروں کے طبقاتی، سماجی مذہبی اور پیشہ ورانہ مشاغل ہیں۔ منٹو انسان زندگی کا مطالعہ ہمیشہ اس کے مخصوص

طبقاتی اور سماجی پس منظر میں کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سوگندھی، ممی، موذیل، سلطانہ، شانتی، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور بابو گوپی ناتھ جیسے بھی مذہب اور فرقے کے لازوال کردار خلق ہوئے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے سماج میں ایسے کرداروں کو پیش کرنا بہت اہم ہوسکتا ہے جو خود اس سماج کے جبر کا شکار ہیں۔ منٹو کے سارے کردار ایسے ہی رجحان کی پوری ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر اچھے انسان تھے لیکن اس کاروباری نظام اور مریضانہ ماحول کے شکار ہوگئے۔ نیا قانون کے ''منگو کوچوان'' اور ''خوشیا'' سے لے کر ''موذیل'' اور منظور تک سارے کے سارے کردار کسی نہ کسی مجبوری یا گناہ ناکردہ کی وجہ سے کچھ سے کچھ بن گئے ہیں۔ سب ہی کسی نہ کسی صورت میں ایک نارمل انسان بننے کے جذبات و خیالات حامل تھے مگر سرمایہ دارانہ اخلاق کے قوانین نے ان کی بنیادی معصومیت کو چھین کر ان کے خوب صورت چہروں پر بدنما داغ ڈال دیتے ہیں اور ان کی شخصیتوں میں کجی پیدا کردی ہے۔ منٹو نے غنڈوں، دلالوں، طوائفوں اور نچلے طبقے کے شہری کرداروں کو ان کے صحیح ماحول میں پیش کیا ہے اور ان کے ذہنی کرب اور دبے ہوئے انسانی ہمدردی کے جذبے کو گہرائی سے پیش کیا ہے۔ وقتی باتوں اور حادثوں کو ان کے کرداروں کی تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصوم لڑکیوں کا دلال، یہ فاحشہ عورت اور یہ ممد بھائی جیسا غنڈا انسان دوستی اور شرافت سے ناآشنا ہے، لیکن اس کی گھناؤنی شخصیت کے سینے میں وہی انسانی دل دھڑکتا ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے اور جس کی بنیاد خلوص و محبت پر ہے۔

مثال کے طور پر ''بابو گوپی ناتھ'' منٹو کا ایک اہم کردار ہے جسے رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار دونوں سے محبت ہے۔ وہ انھی دونوں مرکزوں پر رہ کر اپنی زندگی گزرنا چاہتا ہے۔ اس کے گرد جونک کی طرح مطلبی افراد کا حلقہ ہے۔ غلام علی، سردار بیگم، سائیں اور عبدالرحیم سینڈو اس کی دولت کو ہر طرح سے برباد کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ دراصل چغد ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ ایک عورت زینت سے محبت کرتا ہے اور زینت کے مستقبل کی فکر اسے ہر وقت دامن گیر رہتی ہے۔ وہ اپنی دولت کی مدد سے زینت کے لیے ایک شوہر ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ زینت ملائم مٹی کی بنی ہوئی ایسی طوائف ہے

جو گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے۔ گوپی ناتھ زینت کی شخصیت کے اسی پہلو سے شدید محبت کرتا ہے جو زینت کو عیار و مکار بننے سے دور رکھتی ہے اور جب زینت کی شادی ہو جاتی ہے اور افسانہ نگار طنز کرتا ہے تو وہاں بابو گوپی ناتھ کا کردار پوری طرح ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ زینت طنزیہ جملہ سن کر رونے لگتی ہے؟ تو گوپی ناتھ کہتا ہے ”منٹو صاحب میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق ہیں۔ زینت کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا۔ اس کے بعد وہ زینت کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوش رہنے کی دعا دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ بابو گوپی ناتھ کوئی بڑا آدمی نہیں ہے، اس کا ذہنی شعور بھی بہت معمولی ہے لیکن وہ انسان کو پہچانتا ہے اور خود فریبی میں مبتلا ہو کر بھی گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔

ممد بھائی بھی ایک دلچسپ کردار ہے جو فارس روڈ علاقے کا مشہور دادا ہے۔ لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔ وہ ہر ایک کی خبر رکھتا ہے۔ ایک چھریرے جسم کا آدمی ہے جس کے چہرے پر مونچھیں بڑی خوفناک ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری شخصیت ان مونچھوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ نہ جانے وہ کتنے قتل کر چکا ہے۔ مگر وہ سوئی لگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہے اور اپنے محلے کی عزت کی خاطر وہ ایک قتل کرتا ہے اور بعد میں اس کو صوبہ بدر کر دیا جاتا ہے۔ وہ بدمعاش نہیں ہے اور نہ اس نے لوٹ کھسوٹ کر روپے کمایا ہے۔ وہ بس اپنے محلے پر حکومت کرتا ہے اور اپنی رعایا کی ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ اسے اپنی چھری سے اتنی محبت ہے جتنی کسی کو محبوبہ سے ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت میں ذہنی کجی نہیں اور نہ کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ وہ اتنے گندے ماحول میں رہتے ہوئے بھی دوسری لڑکیوں کی عزت کے لیے جان دے سکتا ہے۔ اس کے کردار میں غنڈا پن کے سارے عناصر ہیں پھر بھی اس کی شخصیت جاذب نظر ہے۔ یہی منٹو کی کردار نگاری کا کمال ہے۔

منٹو کے سکھ کرداروں میں سب سے جاذب نظر بشن سنگھ ہے جو ایک پاگل ہے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا زمین دار تھا۔ پاگل خانے میں کئی سال رہنے کے بعد بھی وہ اپنی سرزمین کو نہ بھول سکا اور اس پر صرف ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اس پاگل کردار کی مدد سے منٹو نے اس دور کی سیاست پر گہرے وار کیے ہیں جس کی وجہ سے پنجاب میں

شدید فسادات ہوئے تھے۔ یہ تبادلہ کا خیال ہی فتنہ انگیز تھا۔ گائے بیلوں کی طرح انسانوں کا تبادلہ کہاں کی منطق تھی۔ مگر یہ ایک بھیانک حقیقت تھی کہ تقسیم کو قبول کرنے کے بعد کوئی اور راہ نجات نظر نہ آئی۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر پہنچ کر مرجاتا ہے اور اس طرح پڑھنے والوں پر مجموعی تاثر چھوڑ جاتا ہے کہ اپنی مٹی یا زمین سے انسان کو ہر حال میں محبت رہتی ہے خواہ وہ پاگل ہی کیوں نہ ہو۔ اس کردار کی تخلیق کر کے منٹو نے اپنی اُس ہنرمندی کا احساس کرایا ہے کہ وہ ایک پاگل کو بھی لازوال کردار بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

مردوں کی طرح عورتوں کے بھی دلچسپ کردار منٹو نے تراشے ہیں مگر یہاں تفصیل سے اس لیے گریز کیا جارہا ہے کہ عورتوں اور طوائفوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایسے کرداروں پر خود بخود روشنی پڑ گئی ہے۔ مختصراً یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منٹو کے یہاں عورت کے اتنے رنگوں کے کردار ہیں کہ عورت کی ساری پُراسرار جاذبیت کا راز کھل جاتا ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے مرد کی بے رحمی کو عورت کی تباہی کا ذمے دار ٹھہرایا ہے وہاں وہاں انھوں نے عورت کی معصومیت کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے، بیگو، سوگندھی، سلطانہ، رتنا، موذیل کلونت کور، گھاٹن، زینت، جانکی، نواب، زینب اور لیتکا رانی وغیرہ منٹو کے لازوال کردار ہیں۔

منٹو کے تمام کردار خواہ مرد ہوں یا عورت اپنی اپنی جبلی عادتوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں ایک چیز مشترک رہتی ہے وہ ہے ان کا انسان دوستی کا جذبہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ منٹو کے سارے کردار بنیادی طور سے اچھے ہیں۔ اللہ دتا، ایشر سیاں اور دوسرے کردار انسانوں کی شکل وصورت رکھتے ہوئے بھی انسانی دل ودماغ سے محروم ہیں۔ منٹو کے افسانے ”سرکنڈوں کے پیچھے“ میں ہلاکت کا کردار حیوانوں سے ملتا ہوا ہے۔ مگر ہاں اس کے کردار اخلاقیات سے بالکل عاری بھی نہیں ہیں۔ ان کی اپنی دنیا میں اخلاق کے دوسرے معنی ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ بظاہر وہ کتنے ہی گندے کیوں نہ نظر آئیں لیکن ان کی روح بالکل صاف ہے۔ اس لیے ان کی اخلاقیات عام طور سے بالکل ہی الگ ہے۔ منٹو کے تقریباً سارے کردار جبلتوں کے غلام ہیں اور عقل اور جدوجہد پر ایمان نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں کسی نہ کسی جذبہ

یا جذباتی واقعے کا بڑا دخل رہتا ہے۔ ان کی سرشت میں شر کی زیادہ آمیزش ہے۔ وہ اپنے ماحول سے بہت جلد مانوس ہوکر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ منٹو کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے کرداروں کو انھیں کے ماحول میں پیش کر کے ان کی انفرادیت قائم کی ہے۔

افسانے کی کامیابی کا دارومدار واقعہ نگاری پر بھی ہوتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کے لیے زمین کی حیثیت۔ واقعہ نگاری میں افسانہ نگار کی شخصیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک فنکار کسی واقعہ کو کس طرح دیکھتا ہے اور کیسا محسوس کرتا ہے اور اس سے کیا نتیجہ برآمد کرتا ہے۔ منٹو کا انداز اس سلسلے میں مفکر اور نفسیات شناس کا رہا ہے۔ منٹو واقعہ شناسی کے ماہر تھے۔ ان کے افسانوی واقعات عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتے ہیں لیکن عام آدمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اوپر نیچے درمیان، نو، پانچ دن، لال شلوار، خوشیا، نطفہ، شادان، ننگی آوازیں وغیرہ بہت سے ایسے شاہکار ہیں جو منٹو کی واقعہ شناسی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ واقعات کے تانے بانے کو پلاٹ کے قالب میں ڈھالنا افسانہ نگاری کا بڑا اہم فن ہے۔ ماحول، فضا اور کردار کو دھیان میں رکھتے ہوئے واقعہ نگاری کا کام اس طرح انجام دینا کہ قاری ابتدا سے اختتام تک افسانے کی فضا سے بندھا رہے اور ایک فطری تاثر کے ساتھ انجام تک پہنچے پلاٹ کی کامیابی کی دلیل ہے۔ منٹو پلاٹ کا تانا بانا اس طرح تیار کرتا ہے کہ ہر پہلو کی اپنی نمایاں حیثیت ہوتی ہے۔ تمام باریک سے باریک نکتے ایک ہی مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں اور افسانے کی افادیت کو ابھارنے میں ایسا تاثر پیدا کرتے ہیں کہ افسانہ وحدت تاثر کی مثال بن جاتا ہے۔ ٹھنڈا گوشت ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، موذیل، ممی، نیا قانون اور ہتک ایسے بیشتر افسانے وحدت تاثر سے پُر ہیں۔

منٹو کے افسانوں میں آغاز اور انجام کی کیفیت بھی اسے دیگر افسانہ نگاروں سے منفرد و ممتاز کرتی ہے۔ منٹو اپنے افسانوں کے آغاز پر حد درجہ توجہ دیتے ہیں۔ اس نے نہیں لکھا تھا کہ میں افسانے کا پہلا جملہ لکھتا ہوں اور وہ جملہ افسانہ مکمل کرتا ہے، اسی لیے منٹو کے افسانوں کا آغاز اتنا دل آویز ہوتا ہے کہ قاری کو شروع سے ہی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ مشہور ناقد پروفیسر وقار عظیم نے منٹو کی تمہید کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''منٹو نے اپنے افسانوں کی تمہید سے مختلف موقعوں پر مختلف کام لیے ہیں، لیکن کام خواہ کچھ بھی لیا ہو قاری کے ذہن پر ابتدا ہی سے ایک گہرا نقش بٹھانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔'' (منٹو کا فن)

ایسا لگتا ہے منٹو نے افسانے کی اس خصوصیت پر بھر پور توجہ دی ہے۔ اس لیے سیاسی افسانے ہوں یا سماجی، رومانی، نفسیاتی یا جنسیاتی ہر افسانہ ان ابتدائی مراحل سے بخوبی گزرا ہے اور قاری کے لیے دلنشیں دلچسپ صورت حال لے کر سامنے آیا ہے۔ مثلاً ''نیا قانون کی تمہید ملاحظہ ہو۔

> ''منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔''

اسی طرح ''ہتک'' کی تمہید کا یہ انداز دیکھیے۔

> ''دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اس کی پسلیاں جھنجھور کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس آیا تھا۔''

ان دونوں تمہیدوں کے ذریعے قاری کا تعارف دو کرداروں سے ہوتا ہے لیکن ایک ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ان دونوں کے متعلق کچھ اور جاننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور پورا افسانہ پڑھنے پر اکساتی ہے۔ ان تمہیدوں میں جو تیکھا پن اور آنے والے واقعات کے لیے پیدا کردہ فضا ہے وہی افسانے کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے میں مدد کرتی ہے۔ منٹو کے فنی اختصاص کی ایک اہم کڑی ہے اور یہ کڑی انھوں نے بہت مظبوطی سے تیار کی ہے۔

تمہید کی طرح ہی افسانے کا انجام بھی دوسری اہم منزل ہے جو آخری منزل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ پڑھنے والے کو افسانے کی ساری منزلوں سے گزر کر اس

آخری منزل تک رسائی حاصل کرنے میں ذہنی خلش اور فکری صعوبتوں کی کئی پیچیدگیوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا کہ انجام اس کے قلب ذہن کو سکون اور راحت کا سرمایہ پہنچائے۔ منٹو انجام کی اس اہمیت سے واقف ہیں اس لیے نہ صرف انھوں نے ''انجام'' سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی خدمت انجام دی ہے بلکہ افسانہ کو فنی طور پر یوں مکمل کیا ہے کہ ان کا ہر افسانہ وحدت تاثر کی عمدہ مثال بن گیا ہے۔ انجام میں منٹو کی ہنرمندی درج ذیل دو مثالوں سے واضح ہوتی ہے۔

افسانہ ''نیا قانون'' اس طرح ختم ہوتا ہے۔

''استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہا، مگر کسی نے نہ سنی۔ نیا قانون، نیا قانون کیا بک رہا ہے؟ قانون وہی پرانا ہے'' اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اسی طرح ''ہتک'' کا اختتامیہ ملاحظہ ہو۔

''بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل بہلانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔''

نیا قانون کے خاتمہ میں استاد منگو خان کی اس جذباتی شدت کا ایسا متضاد ردعمل ہے جس سے پڑھنے والے کے دل میں درد کی ایک ٹیس سی رہتی ہے۔ ''ہتک'' کے انجام میں افسانے کے وسیع پس منظر، ایک خاص کردار کے شدید ردعمل اور زندگی کے ایک بڑے دکھتے ہوئے ناسور کو ایک معمولی واقعے سے اس طرح حل کیا گیا ہے کہ تاثر کی شدت کم ہونے کے بجائے ایک مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ خاتمے جہاں پڑھنے والے کی ذہنی انتشار کو مجتمع کرتے ہیں اور اس کے اشتیاق کی تسکین کرتے ہیں وہیں کہانی میں شروع سے بننے والی زنجیر کا آخری اور منطقی رابطہ بھی بن جاتے ہیں۔ منٹو کے ہر خاتمے کی ایک نفسیاتی اور جذباتی حیثیت ہے اور دوسری فنی۔ ان کے خاتموں میں لکھنے والے کی قدرت بیاں اور انداز فکر کی ندرت اور شوخی ہر جگہ ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔

افسانہ آغاز اور انجام ان دونوں مرحلوں کے درمیان منٹو کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی غفلت یا بے نیازی نہیں برتتے ہیں۔ انھیں ہر مرحلے کا پورا احساس ہے اس لیے آغاز سے انجام تک ان کا ہر افسانہ بہت دلچسپ انداز میں دھیرے دھیرے سفر طے کرتا ہے اور منطقی طور پر اس طرح مکمل ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو اختتام تک پہنچنے کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ برجستگی اور روانی ہی افسانہ نگاری کی فنی کامیابی کی دلیل ہے ایسی کامیابی جو ایک ماہر فن کے ہی ہاتھ آسکتی ہے۔

موضوعات، تکنیکوں اور فنی ہنر مندیوں سے قطع نظر منٹو کی زبان اور انداز تحریر بھی ان کا اپنا تھا۔ ان کا اسلوب نگارش بھی ان کی شناخت ہے۔ جزئیات نگاری، منظر نگاری جذبات نگاری اور مکالمہ نویسی ہر جگہ منٹو نے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے۔ 'سڑک کے کنارے' کی ماں جب تخلیق کے دور سے گزرتی ہے تو اس کا جسم اور ہر عضو اس کے جذبات کی زبان بن جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "یہ میرے اندر دہکتے ہوئے چولہوں پر کس مہمان کے لیے دودھ گرم کیا جا رہا ہے۔ یہ میرا دل میرے خون کو دھنک دھنک کر کس کے لئے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات کے رنگ برنگے دھاگوں سے کس کے لیے ننھی منی پوشاکیں بنا رہا ہے۔ میرا رنگ کس کے لیے نکھر رہا ہے...... میرے انگ انگ اور روم روم میں پھنسی ہوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں۔"

ان چند جملوں میں ایک عورت کی روح سمٹ آئی ہے۔ اسی طرح منظر نگاری کے وقت جزئیات نگاری کا جو کمال دکھایا ہے منٹو کے علاوہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ "پہچان" میں کچھ شب زندہ داروں نے جن کمروں کا جائزہ لیا تھا ان میں سے ایک کی تصویر منٹو کے قلم سے یوں بنی ہے:

> "کونے میں ایک بہت بڑا پلنگ تھا جس کے پائے رنگین تھے۔ اس پر میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ بھی پڑا ہوا تھا جس پر سرخ رنگ کے

> پھول کڑھے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار کی کارنس پر تیل کی ایک میلی بوتل اور لکڑی کی کنگھی پڑی تھی۔ اس کے دانتوں میں سر کا میل اور کئی بال پھنسے ہوئے تھے۔ پلنگ کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ٹرنک تھا جس پر ایک کالی رکابی رکھی تھی۔"

منٹو کی جزئیات نگاری کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے کسی واقعے کی مصوری کرنے، کسی ماحول یا فضا کا مجموعی تاثر قائم کرنے یا کسی کردار کی ظاہری ہیئت اور باطنی کیفیات کے اظہار کے لئے جو باتیں بیان کی ہیں ان میں کبھی چھوٹی چیز یا چھوٹی بات کو اس لیے نظر انداز نہیں کہ کیا وہ بات چھوٹی اور غیر اہم ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی اور غیر اہم باتوں کو بھی اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ اہم اور ضروری معلوم ہوں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر آعظمی نے منٹو کی جزئیات نگاری کے حوالے سے لکھا ہے:

> "منٹو کی نزدیک کوئی چیز معمولی اور غیر معمولی نہیں تھی۔ حقیر اور معمولی لگنے والی چیزوں کو بھی انہوں نے اس فن کاری سے برمحل برتا ہے کہ وہ پڑھنے والے کے لئے غیر معمولی تاثرات اور نتائج کی حامل بن گئی ہیں۔ جزئیات نگاری کرتے ہوئے منٹو نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کی طوالت قاری کے لیے بوجھ نہ بنے چنانچہ وہ ایسے ہی الفاظ اور ایسی ہی جزئیات پیش کرتے ہیں جو افسانے کے تاثر کی وحدت برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں اس عمل نے ان کے افسانوں میں غضب کی چستی بھر دی ہے" (منٹو کا فنی اسلوب)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی یہ خوب صورت مثالیں منٹو کے افسانوں کی جان ہیں۔ حالانکہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بظاہر بہت معمولی ہیں لیکن ان کو جذب کر کے موقع و محل کے اعتبار سے استعمال کرنا ہر قلم کار کے بس کا ہنر نہیں۔ بلا شبہ اس قلم کار کے مزاج اس کی دوررس نگاہ اور مشاہدے کی قوت کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

ایک اور عنصر جو منٹو کے افسانوی اسلوب کو منفرد بناتا ہے وہ ہے طنز۔ ایسا بھرپور

طنز جس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ جس میں تندی بھی ہوتی ہے اور تلخی بھی۔ اس طنز میں منٹو کبھی کبھی بے باک اور منہ پھٹ بھی ہو جاتے ہیں مگر وہ کیا کریں جن زخموں کو وہ دکھانا چاہتے ہیں وہ ہمارے معاشرے کے جسم پر صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور رس رس کر ناسور بن چکے ہیں۔ ہم ان کا علاج کرنے کے بجائے انھیں کپڑوں کی تہوں میں چھپانا چاہتے ہیں اور اس طرح خود فریبی کا شکار ہیں۔ ہم نے اخلاق اور شریعت کا ایک معیار بنا رکھا ہے۔ لیکن ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اس لیے منٹو اخلاق کو معاشرے کی چھری پر لگا ہوا زنگ کہتے ہیں اور اس زنگ کو چھڑانے کے لیے جب وہ تند و تلخ باتیں کہتے ہیں تو ان کے طنز کی کاٹ ہمارے ذہن و فکر کو چھلنی کر دیتی ہے۔ ہتک، مائی جیوان، دس روپے وغیرہ پڑھتے ہوئے ہر بار اس طنز کی کاٹ محسوس کرتے ہیں۔

منٹو کے اسلوب و اظہار میں جو قوت اس کا اندازہ ہمیں قدم قدم پر اس وقت ہوتا ہے۔ جب منٹو معمولی سی معمولی بات کو بھی ایک غیر معمول انداز میں کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پاس فقرہ کی ساخت میں معمول تبدیلی اور لفظوں کو برتنے میں تھوڑی سی جدت پسندی کا وہ ہنر ہے جو ان کی ہر چھوٹی اور غیر اہم بات کو منفرد اور پرکشش بنا دیتا ہے۔ مثلاً یہ چند فقرے ملاحظہ کیجیے۔ ’’یہ رنگ برنگی عورتیں مکانوں میں پکے ہوئے پھلوں کی مانند لٹکتی رہتی ہیں، آپ نیچے سے ڈھیلے اور پتھر مار کر انھیں گرا سکتے ہیں‘‘ (پہچان)

’’اندر ہی اندر اس نے ہر ذرّے کو بم بنا لیا تھا کہ وقت پر کام آئے‘‘ (نعرہ)

’’فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے (دھواں)

’’اسے صرف اپنے آپ سے غرض تھی اور بس دوسروں کی جنت پر وہ ہمیشہ اپنے دوزخ کو ترجیح دیتا تھا‘‘ (نیا سال)

’’میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں‘‘ (شوشو)

یہ تمام مثالیں منٹو کے اسلوب کی مختلف خوبیوں کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

وہ بڑی سے بڑی بات کو کس آسانی سے اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو کس جدت پسندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منٹو اپنی نثر میں الفاظ، تشبیہات، استعارات یا تراکیب کا استعمال بڑی سلیقہ شعاری سے کرتے ہیں۔ انہوں نے پرانے الفاظ اور گھسی پٹی تشبیہات سے گریز کیا ہے۔ ان کی تشبیہات اور ترکیبیں ان کی اپنی تخلیق ہیں جن میں برجستگی بے ساختگی اور فطری پن کے ساتھ بانکپن بھی ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو متوجہ کرنے کے ساتھ ساتھ طنزیہ پہلوؤں کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ عبارت بریلوی نے منٹو کی تشبیہوں کو بندوق سے نکلی ہوئی گولی کہا ہے جو سیدھی سادی ہوتی ہیں مگر سیدھے ل پر اثر کرتی ہیں۔ ایسی ہی چند تشبیہیں آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

''ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت ہنڈیا کی طرح گرم ہیں'' (دھواں)

''وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی کا تھان کھول کر نیچے پھینک دیا ہو'' (مصری کی ڈلی)

''وہ بڑی خوفناک عورت تھی۔ اس کا منہ کچھ اس انداز سے کھلتا تھا جیسے لیموں نچوڑنے والی مشین کا کھلتا ہے'' (پہچان)

''دو گالیاں جیسے اس نے اپنی گدّے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر پھینک دیے ہیں'' (نعرہ)

''اس کی شرارت اب دُم کٹی گلہری بن کر رہ گئی تھی''۔ (سجدہ)

منٹو کے اسلوب و اظہار کا کمال وہاں بھی نظر آیا ہے جہاں وہ تضاد کی تکنیک کا استعمال بھرپور اور صحیح طریقے سے کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منٹو کے یہاں ایک بڑا مصور اور ایک زبردست کارٹونسٹ جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے افسانے کے پلاٹ میں اتنی اہم بات نہیں ہوتی جتنی ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہوتی ہے جن میں وہ افسانے کے تاثر کی شدت کو مفید کر دیتے ہیں۔ یعنی گوریلا جنگ کی تکنیک۔ منٹو نے اپنے مضامین میں کہیں ایک روسی مصور کا تذکرہ کیا ہے جس نے اپنے شاگرد کی تصویر پر چند چھوٹے چھوٹے نشانات

ڈال کر اسے کچھ سے کچھ بنا دیا تھا اور شاگرد سے کہا تھا:

> ''فن وہیں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ چھوٹے چھوٹے نشانات''
>
> چنانچہ بعینہ یہی تکنیک منٹو استعمال کرتے ہیں لفظوں میں بھی اور واقعات میں بھی۔ ان کی تحریر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملے افسانے کے پورے تاثر میں اضافے کرتے ہوئے خود اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہوتے ہیں۔ اس طرح واقعات بھی۔ وہ کردار، پس منظر اور رشتے بناتے چلے جاتے ہیں اور کہیں پر بڑی بے ساختگی سے ایک ایسی بات بیان کرتے یا ایک ایسا لفظ لکھ ڈالتے ہیں جو پوری صورت حال کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ یہ خصوصیت صرف اور صرف منٹو کی ہے کسی اور کی ہرگز نہیں ـــــ مثال کے لیے یہ اقتباسات دیکھیے جو منٹو کے فن میں تضاد کی مختلف صورتوں سے واقف کراتے ہیں:
>
> ''اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار بجلی کے اس بلب سے ٹکرایا جو مالک مکان کے گنجے سر کے اوپر مسکرا رہا تھا۔ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر، پھر اس کے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں'' (نعرہ)
>
> ''نوکروں کے متعلق کون غور کرتا ہے؟ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہ تمام منزلیں پیدل طے کر جاتے ہیں اور آس پاس کے آدمیوں کو خبر تک نہیں ہوتی'' (بلاؤز)

دونوں افسانوں میں دو کرداروں کے جذبات اور تصورات کو طبقاتی اونچ نیچ کے پیدا کردہ تضاد میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تضاد ''ہتک''، ''موذیل''، ''خوشیا'' اور ''کالی شلوار'' وغیرہ میں مزید تلخ اور تیکھا رنگ لے کر آتا ہے۔ تضاد کے ساتھ ساتھ منٹو نے الفاظ، جملوں اور جذبوں کے تکرار کو اپنے اسلوب کا حصہ بنایا ہے۔ وہ تکرار کے ذریعے ایک خاص تاثر پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں اور قاری کو آہستہ آہستہ منزل تک لے جاتے ہیں جہاں جذبہ اپنی مکمل صورت میں

شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ نعرہ، بلاوز، ہتک، خوشیا اور ڈرپوک وغیرہ میں تکرار کی فنی صورت زیادہ نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ''ہتک'' میں ''اونہہ'' اور نعرہ میں گالیوں کی تکرار دیکھ کر قاری محسوس کر سکتا ہے کہ افسانہ نگار تصورات اور جذبات کے ساتھ لفظوں کی تکرار سے جو خاص تاثر پیدا کیا ہے، اس سے بہتر ذریعہ اس تاثر کے لیے کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔

منٹو کے فن کی وہ ساری خصوصیتیں جن کا تعلق ایک طرف تو فن کے مطالبات سے ہے اور دوسری طرف زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ کے ان وسائل سے جن کی بدولت افسانہ نگار کا خیال، اس کے تاثرات و تصورات دوسروں کے ذہن و قلب میں جگہ کرتے ہیں۔ یہ بغیر جزئیات پر دسترس اور گہرے مشاہدے کے نہیں پیدا ہو سکتیں۔ منٹو فن کے ان مطالبات سے نہ صرف کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنا منفرد رنگ اور اپنی الگ چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ منٹو کی کہانیوں کے مسائل، موضوعات، جنس زدگی اور بے باکی سے لاکھ اختلاف کریں یا ہدف تنقید بنائیں مگر آپ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے ہیں اور قاری پوری طرح ان کی گرفت میں رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ منٹو نے افسانہ نگاری کے بنیادی لوازمات، اس کی فنی و تکنیکی حد بندیوں اور باریکیوں کو حد درجہ ملحوظ نظر رکھا ہے۔ وہ بھلے ہی سماجی اور سیاسی بندشوں کو خاطر میں نہ لائے ہوں لیکن وہ افسانہ نگاری کی فنی اور تکنیکی بندشوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ ان کے افسانوی اسلوب میں ایک بھی فاضل لفظ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں کی الگ شناخت ہے۔ ان کی ایک منفرد پہچان ہے۔ ان کی نظر میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ انھوں نے زندگی کے سارے پہلوؤں کو اپنی باریک اور نکتہ رس نگاہوں سے اس طرح دیکھا ہے کہ کوئی بھی حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ انھوں نے اپنی ہر کہانی بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کی۔ کیونکہ وہ پیش کش میں فطری اور حقیقی حسن پیدا کرنے کے سارے حربوں سے واقف تھے۔ انھی حربوں اور گروں نے انھیں دنیائے افسانہ میں عظمت، انفرادیت اور منفرد شناخت عطا کی ہے۔

☆☆

منٹو کے منتخب افسانے

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہئے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچادیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کردیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کردیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اس لئے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچادیئے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ ے گوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا: ''مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا: ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا: ''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جارہا ہے — ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرایا: ''مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے — ہندوستانی بڑے شیطانی، آکڑ

آ کر پھرتے ہیں۔“

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے — یہ کہاں ہے، اس کا محلِ وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں — اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے؟

اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا: ”میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں — میں اس درخت ہی پر رہوں گا۔“

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو، سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ، باغ کی ایک خاص روش پر، سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن

میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کے علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا، مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے—اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یوروپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یوروپین وارڈ رہے گا یا اُڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین۔" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے

دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔“

لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ، کی جگہ اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ، نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتا ہے کہ لاہور جو، اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار ”اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین“ کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتادیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا: ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا: ''اوپڑدی گڑگڑدی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف واہے گوروجی دا خالصہ اینڈ واہے گوروجی کی فتح — جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔''

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو — سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا: ''یہ تم سے ملنے آیا ہے — تمہارا دوست فضل دین ہے۔

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: ''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی — تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے — مجھ سے جتنی مدد ہوسکی، میں نے کی — تمہاری بیٹی روپ کور..........''

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا: ''بیٹی روپ کور!''

فضل دین نے رک رک کر کہا: ''ہاں...... وہ...... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے — ان کے

ساتھ ہی چلی گئی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا: ''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں —— اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو —— بھائی بلبیر سنگھ اور بھابھی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا —— اور بہن امرت کور سے بھی ...... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے —— دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے —— اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی ...... اور ...... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں ...... اور یہ تمہارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔''

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لیکر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا: ''کہاں ہے —— وہیں ہے جہاں تھا۔''

بشن سنگھ نے پھر پوچھا: پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

''ہندوستان میں —— نہیں نہیں، پاکستان میں۔'' فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ!

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے اُدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے —— کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی —— پاگل عورتوں کا شوروغوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے، ''پاکستان زندہ باد'' اور ''پاکستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیونکہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے — پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

متعلقہ افسر ہنسا: ''پاکستان میں۔''

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا: ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے —'' اور زور زور سے چلانے لگا: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے — اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی — ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا — ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا!

☆☆

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اُٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پُر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولھے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اُٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سُرمئی غبار۔ ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے مگر اس کے قد و قامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لئے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی: ”ایشر سیاں......“

ایشر سنگھ نے گردن اُٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی: ”ایشر سیاں......“ لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اُٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی: ”کہاں رہے تم اتنے دن؟“

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: ''مجھے معلوم نہیں''۔

کلونت کور بھنا گئی: ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے!''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا: ''کلونت!'' اس کی آواز میں درد تھا۔

کلونت کور ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ ''ہاں جانی'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپہ مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا: ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے......''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ''ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟''

''برے کی ماں کے گھر......'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا: ''قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا: ''تمہیں میری قسم، بتاؤ، کہاں رہے......؟ شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جُوڑا بناتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی: ''نہیں تم ضرور شہر گئے تھے...... اور تم نے بہت سارا روپیہ لُوٹا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے......''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی بھڑک اُٹھی: ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا......؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لُوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم

تمہیں کیا ہوا، اُٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے......"

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا: "دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا...... ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟"

"تیری جان کی قسم، کچھ بھی نہیں۔"

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟"

ایشر سنگھ ایک دم اُٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اُس پر حملہ کیا ہے۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا: "جانی، میں وہی ہوں...... گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی......"

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی: "تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟"

"برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔"

"بتاؤ گے نہیں؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔"

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی — دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اُتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا: "آ جاؤ! ایک بازی تاش کی ہو جائے!"

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: "چل دفان ہو......"

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولھے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی: "نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے......"

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اُتار کے پھینک دیا اور کہا: "لو، پھر ہو جائے تُرپ چال......"

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اُتارتے ہیں، اُسی طرح اس کو اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اُس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا: ”کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو......“

کلونت کور اپنے بازو پر اُبھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی ”بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟“

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا: ”ہونے دے آج ظلم؟“ اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے — کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لووں کو کاٹا، اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے مُنہ بھر بھر کے بوسے لئے، چوس چوس کر اُس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا — کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کرسکا۔ جتنے گُر اور جتنے داؤ اُسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کردیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا: ”ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتّا پھینک!“

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت نا اُمیدی ہوئی تو وہ جھلّا کر پلنگ سے نیچے اُتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اُتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا: ”ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تُو اتنے دن رہ کر آیا ہے، اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟“

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصّے سے اُبلنے لگی: ”میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈّو...... کون ہے وہ الفتی ...... کون ہے وہ چور پتّا؟“

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ”کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں......“

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا: ”ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی...... کھا واہگورو جی کی قسم......

کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی: ''قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں…… تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا…… لے اب کھا واہگورو جی کی قسم…… کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں……؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: ''جانے دے اب کلونت، جانے دے……!''

اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا: ''میری جان! تم نے بہت جلدی کی…… لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے……''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا: ''مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟''

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''اور میں…… اور میں…… بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں…… اسی کرپان سے……''

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی: ''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟'' ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا: ''گالی نہ دے اس بھڑوی کو……''

کلونت چلائی: ''میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟''

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی: ''بتاتا ہوں……'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا: انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے……''

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی: ''ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر……''

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی: ''مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں…… گلا چرا ہے ماں یا میرا…… اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا……''

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے:

"کلونت میری جان! میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا......؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے...... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا...... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے، وہ میں نے تمہیں دے دیے...... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی......"

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا: "کون سی بات؟"

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا:

"جس مکان پر...... میں نے دھاوا بولا تھا...... اس میں سات...... آدمی تھے...... چھ میں نے...... قتل کر دیے...... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے...... چھوڑ اسے...... سُن...... ایک لڑکی تھی، بہت ہی سُندر...... اس کو اُٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا"

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا: "کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سُندر تھی...... میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، نہیں ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ......"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا: "ہوں......!"

"......اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا...... راستے میں...... کیا کہہ رہا تھا میں......؟ ہاں راستے میں...... نہر کی پٹری کے پاس تھوہر کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا...... پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں......" یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: "میں نے...... میں نے پتا پھینکا...... لیکن لیکن......" اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا: "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی: "وہ...... وہ مری ہوئی تھی...... لاش تھی...... بالکل ٹھنڈا گوشت...... جانی، مجھے اپنا ہاتھ دے......"

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

☆☆

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔ وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔ اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی۔ جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ’’بیوڑا‘‘ کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں، جو کاندھے تک ننگی تھی، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور وہ نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرح چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ اپنے جوڑے میں غالباً لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا۔ تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوج کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی، اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوتی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا...... ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟...... یہ بڑی انوکھی عاشق معشوقی ہے!۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے...... سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو ممبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا...... ”سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر...... تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر...... تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ نیچے والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ سمجھیں؟۔ بہت نازک وقت آ گیا ہے۔ میری جان...... اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے۔ تیری جون میں چلاؤں۔“

(سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا نیچے سے ان سیب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر، انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی۔“)

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ ”جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا...... کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ...... ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا...... جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی...... ارے وہ تو ڈرنے لگا...... سنتی؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا!...... وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ جائے گا...... بولا...... روشنی کرو روشنی کرو...... میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا...... بولا لائٹ...... لائٹ...... اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ ”بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!“ ...... اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی...... تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا۔ تجھے شرم نہیں آتی مردوے۔“ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی!...... وہ پھر گھبرانے لگا...... تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا، کبھی اُجالا، کبھی اُجالا، کبھی اندھیرا...... ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا...... سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا...... جمنا، تو بالکل اُلھڑ ہے، بڑے بڑے گُر یاد

ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے!"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی...... "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو...... اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ...... اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے...... خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی...... ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!""

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اسے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں!...... ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں...... جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی، لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات...... کوئی کومل بول...... اس کے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے...... ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر...... انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے یا ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے...... وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، آنند دیتی ہے!...... کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس کے ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز

دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزہ دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے صندوق میں چھپ کر گزار دے۔ جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی!...... کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا...... بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے بے شمار گر یاد تھے، اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ ”سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔“ اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے...... پریم...... کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے...... یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹ کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی، جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا......

”سوگندھی...... تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!“

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار سے وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی،

تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی، دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے سے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا، تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی، جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں!...... سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ ’’تجھے لاج نہیں آتی۔ اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟...... اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟...... چھی چھی چھی...... دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟...... اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا...... مجھے عورت چاہئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہئے؟...... مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں!۔ تیرا میرا ناتا بھی کیا ہے، کچھ بھی نہیں...... بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی کے چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی، تیرا من کچھ اور سوچتا ہے، میرا من کچھ اور...... کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری...... پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے...... یہ دھندا چھوڑ...... میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا...... کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟‘‘

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا...... ’’سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا...... اور پانی کا یہ گھڑا...... دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ...... یہ چیتھڑے...... یہ چندیاں...... اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کر باہر پھینک ان کو...... اور تو نے اپنے بالوں کا ستیاناس کر رکھا ہے...... اور...... اور...... تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔

اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گدڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا، دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے...... ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھی اس نے سوگندھی کو ...... اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

''مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔'' دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......''

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا۔ تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟'' اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔'' ...... دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی زندگی بسر کر رہے تھے...... لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی بجلی کا قمقمہ جسے اوٹ کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی، مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی...... رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی...... دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو

س کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑھا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ ''رام لا؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا۔ ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھنکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟''...... پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔ ''اندر کوئی ہے تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا۔ ''نہیں''۔...... تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ''تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟...... بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا...... اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں...... چل چل ایک دم جلدی کر۔''

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ ''رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔''

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ ''یہ بات نہیں رام لال۔''...... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں...... بہت پی گئی۔''

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ''تھوڑی بچی ہو تو لا...... ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں۔''

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ ''بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا...... دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔''

رام لال نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے...... تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ

تک چل سب ٹھیک ہو جائے گا۔”

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ کبھی قبول نہ کرتی تھی، مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ “بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔” مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیلی کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہوگئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں اور بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔ بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے۔ پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی...... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ “لیجئے وہ آ گئی...... بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔” پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ “سوگندھی، ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔”

سوگندھی ساڑی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی سیٹھ جی نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکاچوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی

اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ!'' نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا......

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟...... کیا؟''

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ ''پسند نہیں کیا تجھے؟...... اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔''

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر...... کہاں تھا وہ سیٹھ...... تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا...... اس کی......

گالی اس کے پیٹ کے اندر اٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ ''ارے سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی بس ایک منٹ کے لئے۔'' پر وہ سیٹھ لعنت ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑی جو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑی کے چیتھڑے اڑا دے، کیونکہ ساڑی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔ ''میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے...... پر...... پر...... یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور...... یہ بازار...... اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک''...... یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں ادھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑپھڑاہٹ اسے ہوا کے جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو، ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ یہ کیا تھا؟...... لعنت! یہ وہی ”اونہہ“ تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ تجھے پسند نہیں کیا! اسے...... اسے...... صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی...... نہیں آئی کیا ہوا؟...... مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی...... وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بری صورت تھی اس کی، کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ٹھیک ہے، پر سوگندھی...... تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔ اونہہ۔ اس ”اونہہ“ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اونہہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔ دس روپے اور یہ عورت...... خچر کیا بری ہے......“

سوگندھی سوچ رہی تھی اور کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، ایک بار پھر ہو۔ صرف ایک بار...... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک

ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ...... سوگندھی ...... اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور ...... اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے...... جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے، ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ''تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟''...... آنکھوں نے کیا ہوا سوال چند لحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا۔ جواب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلاء کو گھورتی رہی، جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ...... یہ آواز کہاں سے آئی؟ سوگندھی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ پایا۔ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اس کا دل اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا تھا۔ ''رات کٹی گن گن تارے''۔ کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسماں تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''کتنے سندر ہیں۔'' وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دل میں کودا۔ ''تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے...... کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟''

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا

متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی، پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا رہا کرتی تھی ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا، اب اس کے پاس واپس جانے کے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس کر دیئے تھے۔

"مجھ میں کیا برائی ہے؟"۔ سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری، ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ کوئی...... کوئی...... اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بری ہے، جو تجھے برا کہے، وہ آپ برا ہے"...... نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ "سوگندھی تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شئے کو اپنی گود میں لینے کے لئے تیار ہو رہی تھی؟ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شئے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟...... وہ کیوں اپنے اندر اس

موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے...... اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے۔ ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو...... کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا...... اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور...... اور......

"نہ آئے...... بلا سے...... میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں...... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کا دردِ سر ہی تو ہے...... چل سوگندھی گھر چل، ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا...... فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا...... سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی"......

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں...... اس سیٹھ نے...... پرماتما کرے...... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی...... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا...... کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی۔ یہی لینے آیا تھا نا تو؟...... لے دام دیے بنا لے جا اسے...... پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اس سیٹھ سے ایک بار صرف ایک بار۔ اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں، یہ نہیں، یہ کرے...... یوں اس سے

انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں...... لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی...... بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا!۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کرتی ہے...... وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہوگی تو؟...... کیوں؟’

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی اس میں حصّہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتا تھا۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔ ”میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی۔“

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ ”انتظار؟...... تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔“ سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں...... اور......“

مادھو خوش ہو کر بولا۔ ”اور میں آ گیا...... بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ، دل کو دل سے راہ ہے...... تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟“

سوگندھی نے جواب دیا۔ ”چار بجے کے قریب“

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ ”اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔ جیسے تو پھولوں کی ساڑی...... ارے بالکل یہی ساڑی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں کیا تھا۔ تیرے ہاتھوں میں!...... ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی

تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔

"مادھو، تو چنتا کیوں کرتا ہے؟" ۔ لے یہ تھیلی...... ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟"...... سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا...... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!...... بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس روپے ہوں تو انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے...... تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے...... ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔ "مادھو، یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟...... جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے...... بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے...... جان بچی لاکھوں پائے...... بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے...... مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا...... کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے...... واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا...... اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس"! یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شئے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی"۔ ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ "کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔ ''اس کی...... منشی پالٹی کے اس داروغہ کی...... ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا...... کہتا تھا۔ ایک رانی مجھ پر عاشق ہوگئی تھی...... اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔'' یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا۔ ''رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔''

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا پھر ہنسا۔ ''ہی ہی ہی......''

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ''اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے!۔ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا...... کیوں مادھو؟''

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور ہنسا۔ ''ہی ہی ہی......''

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ''اونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔ ''اچھا کیا؟...... مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا...... پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے...... یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟...... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپائے ہوئے تھے اس نے......

......آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا۔''

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ دیکھو سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے…… اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں……“

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا…… اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا…… ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟“ مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ ”میں بتاتی ہوں…… پندرہ روپیہ بھاڑا ہے۔ اس کھولی کا اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا…… اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے ہوتے ہیں، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا، جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا…… تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری…… پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیا ناس کر رکھا ہے؟“

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا ”سوگندھی!“

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ ”یہ چیتھڑے، یہ چندیاں…… اُف کتنی بری باس آتی ہے، اُٹھا کر باہر پھینک ان کو……“

مادھو چلایا۔ ”سوگندھی!“

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے، یہاں؟۔

تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گھبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں…… کتے کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں کیا؟…… بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟…… میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟…… چور یا گٹھ کترا؟…… اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟…… بلاؤں پولیس کو؟ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں۔“

مادھو سہم گیا۔ دبے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ ''سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے۔''

''تیری ماں کا سر...... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے، ورنہ......''

سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھی چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی ''خبردار...... پڑے رہنے دے وہیں۔ تو جا، تیرے پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے...... جیسے مسافروں سے لگی ہوئی گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے...... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلاء کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ اُدھر خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اسے اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

☆☆

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ____ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اُٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رُواں رُواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اُوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ____ محلّے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ____ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔

اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ۔ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ ''نرنجن یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیا کرتا ہے۔'' مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ ''یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئی ہے بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے۔''

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے۔ یا وہ کہانیوں کا کوئی قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کیلئے اچھا تھا۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوئی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔ کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگر سنگھ کی بہن تھی، مگر

بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اسکے نقش پتلے پتلے تھے جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو "گوڈے گوڈے" عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چُغہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ باہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ

ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ــــ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موزیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موزیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موزیل کی کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موزیل اس کے اوپر تھی کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی، بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں ــــــ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موزیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موزیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ ''یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے''۔ اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں ''گوڈے گوڈے'' دھنس جائے گا۔ اور وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا

شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پر تکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی۔ ''تم سکھ ہو۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔''

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا۔ ''کون سی نازک باتیں۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟''

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی۔ ''یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ـــــ ہاں وہ میرے یار ہیں۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو''۔

ترلوچن بڑے دلیلانہ انداز میں پوچھتا ہے۔ ''اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی''

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ ''تم سچ مچ سکھ ہو ـــــ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ۔ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کس سکھنی سے شادی کر لو ـــــ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا''

ترلوچن نرم ہو جاتا ـــــ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرستان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیا کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ ''گوڈے گوڈے'' اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا

حصہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب موذیل مُوڈ میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔ ''موذیل ___ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو''۔

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔ ''میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔''

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ___ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے''۔

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ ''تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ___ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ___ تم خوبصورت ہو''۔

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں ___ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم ''پھوں پھوں'' کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہوگئی۔ ''میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ___ تم تکلیف نہ کرو''۔

ترلوچن چلایا۔ ''موذیل''۔

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔ ''خدا کی قسم ___ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ___ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میری نیوی بلو اسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ___ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی''۔

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کر دی ___ اس میں جو پنیں لگی تھیں ___ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ یہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے

اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب ڈاڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔ ''تمہارے بال بہت ملائم ہیں ___ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میری نیوی بلوسکرٹ صاف ہو سکے گا ___ ترلوچ ___ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی''۔

اب تو ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو ___ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ___ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں''۔

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ ''مجھے معلوم ہے''۔

''پھر''۔ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ___ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

''مجھے معلوم ہے''۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لگی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی''۔

ترلوچن اچھل پڑا۔ ''سچ''؟

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لمحے کے لئے چمکے۔ ''ہاں!''

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ تو......تو کب؟''

موذیل الگ ہٹ گئی۔ ''جب ___ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!''

ترلوچن اس وقت ''جو ہو سو ہو'' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ ''میں کل ہی کٹوا دوں گا''۔

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ___ تم میں اتنی ہمت

نہیں ہے"۔

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ "تم دیکھ لوگی"۔

"دیکھ لوں گی"۔ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا___ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوادئے اور داڑھی بھی منڈوادی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرلیس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹنکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ۔ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی اسکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے اسکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔ "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو"۔

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ایسے ہی چلتا ہے"

ترلوچن کو پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "شادی کل ہو گی!"

’’ضرور‘‘۔ موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کاروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہوجانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ ترلوچن وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟___ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا___ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کررہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کرچکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگیں کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب وگل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔ ’’تم سکھ ہو___ مجھے تم سے نفرت ہے!‘‘

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادّہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دوٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی۔ ''یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ___ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو ___ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ___ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ___ تم سکھ ہو ___ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ___ شرم آنی چاہئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!''

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا فوٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا

ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں___ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹنکی کے پاس موذیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی___ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چیخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا۔ "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟"۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی___ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں___ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِّعمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی ننھی داڑھی دیکھنے لگی۔ "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟"

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو اسکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟"

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ بیمار رہی ہو؟"

"نہیں"۔ موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"کمزور دکھائی دیتی ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں"۔ موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی "تم گویا کہ___ اب پھر___ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو"۔

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہاں!"

''مبارک ہو۔'' موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔'' کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟''

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں!''

''مبارک ہو۔ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟''

''نہیں''۔

''یہ بہت بری بات ہے''۔ موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔ ''ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے''۔

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔ ''کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟''

''نہیں''

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے ''نہیں'' کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکرے کر دیے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ ''تم اب یہ داڑھی منڈوا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو میں تم سے شادی کر لوں گی''۔

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف با عصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مرّوت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔ ''موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ___ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ ''وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟''

“اس کو ابھی تک معلوم نہیں ___ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ محض انتقامی طور پر ___ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے”۔ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجانی شروع کی۔ “یہ بہت اچھا ہے ___ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ___ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے”۔

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ “کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟”

“ابھی کچھ پتہ نہیں”۔ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ “ترلوچ۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟”

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ “تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟”

“مشکل! ___ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ___ کسی بھی معاملے کی نزاکت ___ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ___ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا”۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ “افسوس بی ڈیمڈ سلی ایڈیٹ ___ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس ___ کیا نام ہے اس کا ___ اس محلّے سے بچا کر لانا کیسے ہے ___ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ___ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو۔ اور بہت ڈرپوک ___ مجھے نڈر مرد چاہئے ___ لیکن چھوڑو ان باتوں کو ___ چلو آؤ تمہاری اس کور کو لے آئیں!”

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ “کہاں سے؟”

“وہیں سے جہاں وہ ہے۔ میں اس محلّے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ”۔

"مگر سنو تو ___ کرفیو ہے"۔

"موزیل کے لئے نہیں ___ چلو آؤ"۔

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

موزیل نے کہا۔ "یہ تمہاری داڑھی۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ سکھ ہو"۔

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا"۔

موزیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔ "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں"۔

"کیوں ٹھیک نہیں"۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ___ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا"۔

موزیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو۔ گدھے کہیں کے ___ اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو"۔

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "موزیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی"۔

موزیل چڑ گئی۔ "اوہ تمہاری محبت بی ڈیمڈ ___ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اسکی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے"۔

ترلوچن نے کہا۔ "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں"۔

بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلّے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ ’’مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!‘‘

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ ’’گدھے۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہوگے ___ تمہاری وہ ___ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ___ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان نہ رہے گا ___ تم سکھ ہو ___ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!‘‘

ترلوچ بھنا گیا۔ ’’بکواس نہ کرو!‘‘

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی ___ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں‘‘

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ ’’تم کپڑے نہیں پہنوگی!‘‘

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ’’نہیں۔ چلے گا اسی طرح‘‘۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کیے سگریٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ ’’تم بہت ذلیل ہو‘‘۔

موذیل مسکرائی۔ ’’یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔‘‘ پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ ’’یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔‘‘

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیماری معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔‘‘

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا بھی کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ ''اے ___ کدھر جا رہا ہے''

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ ''اوہ، تم ___ ہم کو پہچانا نہیں تم نے ___ موذیل....'' پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اِدھر اس باجو.... ہماری بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے....''

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا۔ ''لو پیو''۔

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا۔
''ہیر از لائٹ!''

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔ جس میں سے گزر کر انہیں محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطرہ سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے ڈر ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس

کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا۔ ترلوچ ڈیئر۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ___ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ سچ کہتی ہوں یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے''۔

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلّے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ''۔

دونوں چلنے لگے ___ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ ''اے کیا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے''۔ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''کریم۔ اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر''۔

اس آدمی نے نیفے سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا۔ ''عیش کر سالی عیش کر''۔ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ ''کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!''

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''کوئی ذلیل حرکت نہیں ___ سب چلتا ہے آؤ''۔

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ___ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔

یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلّے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔ ''کس گلی میں جانا ہے؟''

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ ''تیسری گلی میں ___ نکڑ والی بلڈنگ!''

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس

کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ ''موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔ ''ترلوچ ڈیئر۔ یہ پگڑی اتار دو!''

ترلوچن نے جواب دیا۔ ''میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اُتار سکتا!''

موذیل جھنجھلا گئی۔ ''تمہاری مرضی۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے''

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ___ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔ ''دیکھو ایسا کرو ___ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ___ تم میرے پیچھے آنا ___ بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ___ سمجھے ___ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو''۔

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھی ___ سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ ''کون مالا؟''

ترلوچن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''دوسرا''۔

''چلو''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہولیا زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دُور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پہ دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی ''مہنگا سنگھ جی ___ مہنگا سنگھ جی!''

اندر سے مہین آواز آئی۔ ''کون!''

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ___ جو بے حد سہی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سُرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"۔

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ___ اور اپنی ماتا جی سے بھی ___ لیکن جلدی کرو"۔

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا۔ "کسے!"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ___ تم یہ کپڑے اُتارو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آنا فانا اس کی قمیض اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اُتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اُتار کر ترلوچن سے کہنے لگی۔ "جاؤ، اسے لے جاؤ ___ لیکن ٹھہرو"۔

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دئے اور اس سے کہا۔ "جاؤ ___ جلدی نکل جاؤ"۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "آؤ"۔ مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں"

"جہنم میں جائیں وہ ___ تم اسے لے جاؤ"۔

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی"۔

ایک دم اُوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔

"سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں ___"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ"۔

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔ تم میرے پیچھے بھاگنا ___ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے ___"

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ "پھر؟"۔

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری ___ کیا نام ہے اس کا ___ موقعہ پا کر نکل جائے ___ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا"۔

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ___ اُوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آرہی ___ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اُترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اردگرد

جمع ہو گئے ___ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔ ''موذیل ___ موذیل''۔

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔ ترلوچن نے اپنی پگڑی اُتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ ___ میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں ___ میرا مطلب ہے وہ ___''

ترلوچن اس کا مطلب ''سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصّے میں کہا۔ ''تم سچ مچ سکھ ہو ___ جاؤ دیکھ کر آؤ''۔

ترلوچن اُٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ میاں بھائی ہے ___ لیکن بہت دادا قسم کا ___ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں''۔

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ ''اوڈیم اِٹ ___ '' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''آل رائٹ ڈارلنگ ___ بائی بائی''۔

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ ''لے جاؤ اس کو ___ اپنے اس مذہب کو''۔ اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

☆☆

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اسکی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کے دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کندھے پر تھپکی دے کر مدبّرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی۔ ”دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا” ۔ولایت میں اور کہاں“؟۔

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے پر جتنے کوچوان حلقہ بنائے حُقّہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اسی روز شام کے قریب جب وہ اڈّے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقّے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکّرانہ لہجے میں کہا:۔

”یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو، چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے

------اور دیکھ لو۔ جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔” یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ “یہ کانگریسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے لیکن ہندوستان سدا غلام رہیگا۔ ہاں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بدعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔”

اُستاد منگو کو، انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظُلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کُتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مُکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر مار بل مارکہ سگریٹ پیتے یا حُقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے، کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

------یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ “آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے، رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں.....”

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلا رہتا۔

“شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی......جیسے کوڑھ ہو رہا ہے......بالکل مُردہ، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے”.....یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی، لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اُٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے"۔

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں۔ اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا..... کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"۔

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی"۔

کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے"۔

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھتی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کے پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیارے سے کہتا۔ "چل بیٹا چل بیٹا..... ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے"۔ مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھا سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا۔ "ہت تیری ایسی کی تیسی"۔

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے

قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'' بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی----- ''غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل۔ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا''۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی ہمیشہ کے لئے بلوں میں غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔ لا ہاتھ ادھر----- ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔

یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔ ''تو اب دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔''

استاد منگو موجودہ سویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اس نے ''روس والے بادشاہ کو'' انڈیا ایکٹ'' یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ انہیں ''روس والے بادشاہ'' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں ''روس والے بادشاہ'' اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے۔ تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے اس لئے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا۔

نئے آئین نے میری امید بڑھا دی ہیں اگر ____ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں"۔

"وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ____!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں۔ اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دھکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں

نظر آئیں گی۔ ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پُرانی نظر آئی —— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھیں اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱/مارچ کو چوہدری خُدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی —— ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دُکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں"۔ اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دُکانیں کُھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دُکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا —— ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے

گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

''تُو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی''؟

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا دائی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔ ''ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو''۔

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔

''چلو یہ بھی اچھا ہوا__ شاید چھاؤنی ہی میں سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے''۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اتار دیا اور جیب سے سگریٹ

نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا___ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تھا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سُست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا۔ ''ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔''

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکتے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

''صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے''؟

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس ''گورے'' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب ''گورے'' نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رُخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے ''گورے'' کو یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا۔ ''جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے'' یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

''وہی ہے''۔ اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے۔ جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے۔ مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ ''کہاں جانا مانگتا ہے؟''

استاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ ''ہیرا منڈی''۔

''کرایہ پانچ روپے ہوگا''۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا پانچ روپے۔ کیا تم ____؟''

''ہاں، ہاں، پانچ روپے۔'' یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ ''کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟''

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا

تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے پیچھے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں، پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔ اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں نیا قانون!"

اور بیچارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو ___ قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

☆☆

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: ”دس لیف، ویری بیڈ......“ یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانے ہی کو کچھ نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی: ”صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔“ اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی: ”صاحب، تم ایک دم اُلو کا پٹھا ہے، حرامزادہ ہے...... سمجھا!“ یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ــــ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی، ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں ــــــــ اس کے پاس صرف چھ آدمی آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ساڑھے اٹھارہ

روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا تھا: ''بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے......'' جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا: ''دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک ڈھیلا تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔'' چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا: ''لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔'' اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے، غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں —— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر پانی ایک دم اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدابخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈروکونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا: ''کیا ہوا......؟ یہ چیخ تمہاری تھی......؟''

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا: ''یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا، چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں......''

اس پر خدابخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا، اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے، وہ اس کی تلاش میں آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی، اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں، دس پندرہ اچھی اچھی ساڑیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ

جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تا کہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں نیچے دوکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی —— ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ''کوئلوں کی دکان'' لکھا تھا، وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں 'شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا: ''کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا...... مانتی ہوں، آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے......''

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا: ''میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں...... یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ......'' وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ جن سے سلطانہ نے صرف

ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو ——— اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا: ”تم میری سنو اور چلو واپس انبالے...... یہاں کیا دھرا ہے......؟“ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے، اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے......“

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا: ”نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔“

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بچّے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آ کر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال واسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی

نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک بھک بھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے، دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے...... نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر ڈھکیلتے رہتے ہیں ——— سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا: ”دیکھو میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔“ مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی: ”جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا......“

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم

کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسب معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ باہر بالکنی میں چلی گئی تا کہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے، پر انجن کوئی بھی نہ تھا —— شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا، اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹریوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا: ”آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟“

وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا: ”تمہیں کیسے معلوم ہوا...... ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟“

اس پر سلطانہ نے کہا: ”یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے......“

وہ یہ سن کر پھر مسکرایا: ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے...... میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے......'' یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سلطانہ نے پوچھا: ''آپ جا رہے ہیں؟''

اس آدمی نے جواب دیا: ''نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں...... چلو، مجھے تمام کمرے دکھاؤ......''

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا: ''میرا نام شنکر ہے......''

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا: ''فرمائیے......!''

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا: ''میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے......''

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا: ''میں سمجھا...... لو اب مجھ سے سنو۔ جو کچھ تم نے سمجھا ہے، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے......''

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی: ''آپ کام کیا کرتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا: ''یہی جو تم لوگ کرتے ہو!''

''کیا؟''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''میں ...... میں ...... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''میں بھی کچھ نہیں کرتا۔''

سلطانہ نے بھنا کر کہا: ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ...... آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے؟''

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی؟''

''میں جھک مارتی ہوں ......''

''میں بھی جھک مارتا ہوں ......''

''تو آؤ، دونوں جھک ماریں ......''

''حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔''

''ہوش کی دوا کرو ...... یہ لنگر خانہ نہیں ......''

''اور میں بھی والنٹیر نہیں ......''

سلطانہ اب رک گئی۔ اس نے پوچھا: ''یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا: ''الو کے پٹھے ......''

''میں اُلو کی پٹھی نہیں ......''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ضرور اُلو کا پٹھا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے ......'' یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: ''تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو ......''

شنکر مسکرایا: ''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔''

''جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ...... بولو، رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں ......''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی: ''تو جاؤ، رستہ پکڑو ......''

شنکر آرام سے اٹھا، پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو، بلا لینا ...

بہت کام کا آدمی ہوں۔"

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا: "تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: "پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں......"

"کچھ انھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے...... پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں، وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی: "تم سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو...... میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں، نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ، کیا ہو گا...... یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا......"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے...... خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب یہ برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے، کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لادو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے، اس کو میں رنگوالوں گی۔ سفید

نیلون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو...... دیکھو، تمہیں میری جان کی قسم! کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو...... میری بھتی کھاؤ، اگر نہ لاؤ......‘‘

خدابخش اٹھ بیٹھا: ’’اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو...... میں کہاں سے لاؤں گا ...... افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں......‘‘

’’کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔‘‘

’’دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے......‘‘

’’تم کچھ نہیں کرو گے...... تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو...... جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟‘‘

’’اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر خدابخش اٹھا: ’’لو، اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔‘‘

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو خدابخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی—— دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نیلون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آ کر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی—— اب شام ہو گئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔

نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدّت ہو گئی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے دراصل اس نے ایسی

ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: ''تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ...... میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔''

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: ''نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے......''

شنکر اس پر مسکرا دیا: ''تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔''

''کیسی شرطیں؟'' سلطانہ نے ہنس کر کہا: ''کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟''

''نکاح اور شادی کیسی؟ نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں...... چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو......''

''بولو، کیا بات کروں؟''

''تم عورت ہو...... کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے......''

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: ''صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......''

''جو دوسرے چاہتے ہیں۔''

شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا......''

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں......''

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: ''میں سمجھ گئی......''

''تو کہو، کیا ارادہ ہے......''

تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔''

''تم غلط کہتی ہو...... اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو...... تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟''

''سلطانہ ہی ہے......''

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: ''میرا نام شنکر ہے...... یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ، اندر چلیں......''

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: ''شنکر، میری ایک بات مانو گے؟''

شنکر نے جواباً کہا: ''پہلے بات بتاؤ۔''

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: ''تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر......''

''کہو کہو...... رک کیوں گئی ہو۔''

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: ''بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں...... یہاں کے سارے دکھڑے تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے......''

شنکر نے یہ سن کر کہا: ''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم کالی شلوار بنوا سکو۔''

سلطانہ نے فوراً ہی کہا: ''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔''

شنکر مسکرایا: ''میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی...... لو، بس اب خوش ہو گئیں نا! پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا: ''کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟''

سلطانہ نے ہنس کر کہا: ''تم ان کا کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔''

اس پر شنکر نے کہا: ''میں نے تم سے بندے مانگے ہیں، ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو......''

''لے لو......'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ پھر اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: ''ساٹن کی کالی شلوار ہے...... دیکھ لینا شاید لمبی ہو...... اب میں

چلتا ہوں......"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ویسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا "قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے...... کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا: "آج ہی درزی لایا ہے......" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں: "یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟"

مختار نے جواب دیا: "آج ہی منگوائے ہیں......"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

☆☆

بُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہار ہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگوں والے پلنگ پر جواب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا، ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہار ہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔

شام کے قریب، دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لئے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی — رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا، صرف اس لئے اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس

لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچن چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابلِ نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سُناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دُھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں —— یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلا سکے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا کہ: ”یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی......“

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ اُبھر آیا تھا —— کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا: ”میں کیا کروں، نہیں کھلتی......“

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور

میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لمحے کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب وغریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ اُبھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے، ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی کیونکہ جو کچھ انھیں کہنا سننا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چُوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو ان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لمحے کے لئے کپکپا اُٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ تمام باتیں سُنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سُنانا چاہئیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبُو تھی، وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے یہ بُو جو بدبُو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بُو نہ اُڑتی —— یہ بُو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی، اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بُو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے، عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے، ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی، جو مائل پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی —— وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلی تھی، رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی باس پیدا ہوتی ہے، لیکن نہیں، وہ بُو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی —— عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی بلکہ اسے عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بُو نکلی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود ناقابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو یہ مطلب سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے...... اسی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے، ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے —— برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اسی کمرے میں ساگوان کا صرف ایک

پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا، بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے مُنہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا، ایک گوری چِٹی لڑکی اپنے سَتر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی ـــ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سُرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اُترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیض، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ ـــ سب کا رنگ سُرخ تھا، بے حد سُرخ۔ یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سُرخی اور مقیش کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا، بے جان سا، اُڑا اُڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچّے رنگ نے جابجا لال لال دھبّے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دُودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال مُنڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سُرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا: کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے، کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح کیونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ہلنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چُست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازار بند کا نشان ـــ وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہو۔ برسات کے وہی دن تھے پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چِٹی لڑکی کے کچّے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے

ہوئے محسوس کیے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سُنی —— لیکن وہ پکار کہاں تھی، وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بُو میں سونگھی تھی، وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچّے کے رونے سے کہیں زیادہ قابلِ فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتّے لرز رہے تھے مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دُور بہت دُور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اسے مٹمیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دُھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی، ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چِٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزا کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جو بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس، بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبّوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بُو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکلی تھی۔ وہ بُو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دُور رس تھی، جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا، جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی، رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی —— وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتّے بارش میں نہا رہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

☆☆

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر کے دو بجے چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔۔۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے، متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر اُدھر بھٹک گئے۔

صبح دس بجے کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں اور بچوں کا متلاطم سمندر دیکھا تو اس کے سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہو گئیں اور وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔۔۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور بپا تھا لیکن بوڑھے سراج الدّین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہی خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں ہے۔۔۔ مگر اس کے ہوش وحواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدّین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں تو تیز روشنی اس کے وجود کے سارے ریشوں میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے ذہن میں کئی تصویریں دوڑ گئیں: لوٹ، آگ...... بھاگم بھاگ...... اسٹیشن...... گولیاں...... رات اور سکینہ......

سراج الدّین اک دم کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے پاگلوں کی طرح اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ ”سکینہ...... سکینہ......“ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ چلا۔۔۔ چاروں طرف اک دھاندلی سی مچی ہوئی تھی۔ کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔

سراج الدّین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور اپنے حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی، لیکن سوچتے ہوئے اس کا دھیان سکینہ کی ماں کی لاش پر جم گیا

جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں ——— وہ اس سے آگے کچھ اور سوچ نہ سکا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا ——— لیکن سکینہ کہاں ہے، جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا: ''...... مجھے چھوڑ دو، فوراً سکینہ کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ......''

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی ——— اور وہ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ دوپٹہ اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا اور سکینہ نے چلا کر کہا تھا: ''......ابا جی، چھوڑیے......!'' لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ——— یہ دھیان آتے ہی اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر دوپٹہ نکالا، سکینہ کا وہی دوپٹہ ——— لیکن سکینہ کہاں ہے؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکا: کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا؟ کیا وہ اس کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئی تھی؟ کیا راستے میں گاڑی کے رکنے پر اور بلوائیوں کے گاڑی میں گھس آنے پر وہ بیہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گئے......؟

سراج الدین کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا ——— سراج الدین کو ہمدردی کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے، سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی ——— اس نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد سراج الدین کے ہوش و حواس کسی طرح درست ہوئے تو وہ ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے ——— وہ آٹھ نوجوان تھے۔ ان کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔

اس نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا: ''گورا رنگ ہے اس کا اور بہت ہی خوبصورت ہے وہ...... مجھ پر نہیں ہے، اپنی ماں پر ہے...... عمر سترہ برس کے قریب ہے...... آنکھیں بڑی بڑی، بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل...... میری اکلوتی لڑکی ہے...... ڈھونڈ لاؤ اسے، خدا تمہارا بھلا کرے گا......''

رضا کار نوجوان نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہو گی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچّوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا—— لیکن دس روز گزر جانے پر بھی انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ پھر اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھہرٹے کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی—— لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

رضا کاروں نے لاری روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔

ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا—— لڑکی خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا سا تل تھا۔

ایک نوجوان نے لڑکی سے کہا: ''گھبراؤ نہیں...... ! کیا تمہارا نام سکینہ ہے......؟''

لڑکی کا رنگ اور زرد ہو گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تمام نوجوانوں نے اسے دم دلاسا دیا تو لڑکی کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدّین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھوں رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی: اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا، لاری میں بٹھایا—— ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بار بار بانہوں سے اپنے سینے کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن گزر گئے—— سراج الدّین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔

وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکّر کاٹتا رہتا لیکن کہیں بھی اسے بیٹی کا پتہ نہ چلتا۔ رات کو وہ دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا، جنھوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہے تو چند ہی دنوں میں وہ اس کے پاس ہوگی......

ایک دن سراج الدّین نے کیمپ میں ان رضا کار نوجوانوں کو دیکھا—— وہ لاری میں بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا—— لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا: ''بیٹا...... میری سکینہ کا پتہ چلا......؟''

سب نے ایک زبان ہو کر کہا: ''چل جائے گا، چل جائے گا......'' اور لاری چل پڑی۔

اس نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کی دعاء مانگی—— اور یوں اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

اسی شام کیمپ میں جہاں سراج الدّین بیٹھا ہوا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ ہوئی——

چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔

اس نے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بیہوش پڑی تھی، لوگ اسے اٹھا کر لا رہے ہیں۔

وہ ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

ان لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال کے سپرد کیا اور چلے گئے۔

وہ کچھ دیر تک ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔

ایک کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا، بس ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بڑھا۔

کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔

اس نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا——— اور چلّایا: ’’سکینہ……!‘‘

ڈاکٹر نے، جس نے کمرے میں روشنی کی تھی، اس سے پوچھا: ’’کیا ہے؟‘‘

اس کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا: ’’جی میں…… جی میں اس کا باپ ہوں……‘‘

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا، پھر لاش کی نبض ٹٹولی اور اس سے کہا: ’’کھڑکی کھول دو……‘‘

مردہ جسم میں جنبش ہوئی———

بے جان ہاتھوں نے ازار بند کھولا———

اور شلوار نیچے سرکا دی———

بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلّایا: ’’زندہ ہے…… میری بیٹی زندہ……

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔

☆☆

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا: ”منٹو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملیے۔“

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیے— ”بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبرون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔“ لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب؟ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے اینٹی کی پینٹی پو؟“

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا: ”آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔“

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا: ”نمبرون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔ بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجیے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔“

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا: ''ہاں ہاں، ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔'' پھر سینڈو سے پوچھا: ''کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟''

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا: ''اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آیئے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے، اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔''

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتا لکھا دیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں، تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا: ''آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جایئے آپ۔ جس آدمی کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے، یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور اسکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو.........''

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا: ''یہ میرا شاگرد ہے۔ اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے، مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی، میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکیے میں بات چیت پیتے کرتے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔''

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہی کشمیر کی کتوبری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہڑ اور ناتجربہ کار

ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے............ دھڑن تختہ!''

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اور سینڈو نے کہا: ''اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔''

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: ''جناب یہ ہے ٹین پوٹی، فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم............ آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔''

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا: ''بکواس نہ کر!'' اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا ''چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔''

سینڈو چلّایا: ''بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا............ بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔''

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلنڈا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا: ''او گوڈ — او میرے رب العالمین — وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا — جاؤ بھئی غلام علی دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔''

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی بار میں ختم کر کے وہ چلّایا: ''دھڑن تختہ منٹو صاحب، وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں ''انقلاب، زندہ باد'' لکھتی چلی گئی ہے — جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔''

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے، مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا، جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا:
’’بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟‘‘

وہ چونک پڑا: ’’جی میں — میں — کچھ نہیں‘‘ یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی: ’’ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں — اور ہمیں کیا سوچ ہوگی!‘‘

سینڈو نے کہا ’’بڑے خانہ خراب ہیں یہ، منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں — لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔‘‘

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: ’’اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب‘‘

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہوگئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی نہیں پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پیے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی، اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے مورفیا کا انجکشن لینا

تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: ''منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: ''بڑا نیک خیال ہے۔''

بابو گوپی ناتھ خوش ہوگیا۔ ''منٹو صاحب! ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جان من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے— منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی۔''

میں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں۔''

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: ''کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب— آپ کو، اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ، زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہئے۔'' زینت کا چہرہ ردعمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہوگیا ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں— لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے گا— بہت گنہ گار آدمی ہوں— وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟''

میں نے کہا ''نہیں نہیں— بہت پی چکے ہیں۔''

وہ اور زیادہ جذباتی ہوگیا: ''اور پیجئے منٹو صاحب!'' یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلنڈا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے: ''سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟''

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہوگئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: ''منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام کی جیب سے گر پڑے گا—''

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب سے سارے روپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر غلام علی کو دے کر کہا: ''جلدی کھانا لے آؤ۔''

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔ پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔ پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے، غلط ثابت ہوا۔ اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے، میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ لیکن میں انہیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جن سے ان کا الو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔

مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار میں چلا جاؤں گا۔''

میں نے اس سے پوچھا: ''رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟''

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا: ''اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔''

میں نے ایک اور سوال کیا'' آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں۔''

اس نے جواب دیا'' بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ــــ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو

دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔''

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب، جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طراز گائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی، اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے، جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی ایک جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے زینت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ

ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتاً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا، جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا: ''او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گزر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟''

سینڈو نے کہا: ''تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ'' میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار، دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ............ کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور ''آیئے منٹو صاحب'' کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ، دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: ''منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت

کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں، بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹریس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گُر سکھائے، غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو — منٹو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بینک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی — آپ بھی اسے سمجھایئے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟“

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا، لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا: ”اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے — کیوں زینو جانی — پسند ہے تمہیں؟“

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے

طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا چونکہ اسکی نیت نیک تھی، اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹریس بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوایا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا: ''شفیق صاحب تو خالی خالی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسہ دیکھئے بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔''

یہ درست تھا۔ الماس، نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا: 'مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے، آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے — ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

شفیق سے مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا، زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے باربنی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یاسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس

سے پوچھا: ''یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟''

یاسین مسکرایا: ''تم جانتے ہو موٹر والی کو۔''

میں نے کہا: ''جانتا ہوں۔''

''تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی — اچھی لڑکی ہے یار!'' یاسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یاسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یاسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں، زینت اور یاسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے — مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میموریل سے یاسین کی آنکھ لڑ گئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یاسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی، میاں! اگر تم نے اس کرستان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کار کا بندوبست کرو، میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا — تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔''

یاسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے، روپے کا بندوبست کرنے، کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو گئے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متحد کوشش کی اور ہر روز تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ، واپس

نہیں آئے گا، اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہئے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا یہ تم کیا کر رہی ہو۔

اس نے بڑے الہڑپن سے کہا: ”مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔

جی چاہا کہ بہت دیر پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو، ٹھیک نہیں، سینڈو اور سردار اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے، مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتٰی کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ وہاں گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصّہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کہ دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا: ”سینڈو!“

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ دھڑن تختہ۔

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو، لیکن سینڈو نے کہا ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے، مجھے آپ سے کچھ پرائیوٹ باتیں کرنی ہیں۔

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا ” واپس لے چلو“

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: ''منٹو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے۔''

میں نے حیرت سے کہا: ''کس سے؟''

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا: ''حیدرآباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں، ان سے زینو کا زیور بن جائے گا— کیوں، کیا خیال ہے آپ کا؟''

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حیدرآباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے، سینڈو اور سردار کی کوئی جعلسازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدرآباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدرآباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدرآباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے۔

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دُگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا: ''منٹو صاحب: خوبصورت نوجوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخشؒ کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔''

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔ محمد شفیق طوسی، محمد یاسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھے۔

ایجاب و قبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا ''دھڑن تختہ''

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارکباد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں سے کہا: ''منٹو صاحب! ذرا اندر جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔''

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی — دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے زینت سے کہا یہ کیا مسخرہ پن ہے۔

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا: ''آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!'' اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھ دار اور لائق آدمی ہیں — زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔''

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا — ''خدا تمہیں خوش رکھے!''

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی — بہت ہی دکھ بھری ملامت — اور چلا گیا۔

☆☆

جی آیا صاحب

باورچی خانے کی دھندلی فضا میں بجلی کا ایک اندھا قمقمہ چراغ گور کی مانند اپنی سُرخ روشنی پھیلا رہا تھا۔ دھوئیں سے اٹی ہوئی دیواریں ہیبت ناک دیووں کی طرح انگڑائیاں لیتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ چبوترے پر بنی ہوئی انگیٹھیوں میں آگ کی آخری چنگاریاں اُبھر اُبھر کر اپنی موت کا ماتم کر رہی تھیں۔ ایک برقی چولھے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی نہ معلوم کس چیز پر خاموش ہنسی ہنس رہا تھا—— دور کونے میں پانی کے نل کے پاس ایک چھوٹی عمر کا لڑکا بیٹھا برتن صاف کرنے میں مشغول تھا—— یہ انسپکٹر صاحب کا نوکر تھا۔

برتن صاف کرتے وقت یہ لڑکا کچھ گنگنا رہا تھا—— یہ الفاظ ایسے تھے جو اس کی زبان سے بغیر کسی کوشش کے نکل رہے تھے۔

’’جی آیا صاحب! جی آیا صاحب!—— بس ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب‘‘

ابھی برتنوں کو راکھ سے صاف کرنے کے بعد انہیں پانی سے دھو کر قرینے سے رکھنا بھی تھا اور یہ کام جلدی سے نہ ہو سکتا تھا۔ لڑکے کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سر سخت بھاری ہو رہا تھا مگر کام کے بغیر آرام—— یہ کیونکر ممکن تھا؟

برقی چولھا بدستور ایک شور کے ساتھ نیلے شعلوں کو اپنے حلق سے اُگل رہا تھا۔ کیتلی کا پانی اسی انداز میں کھل کھلا کر ہنس رہا تھا۔

دفعتاً لڑکے نے نیند کے ناقابل مغلوب حملے کو محسوس کرتے ہوئے اپنے جسم کو ایک جنبش دی۔ اور ’’جی آیا صاحب، جی آیا صاحب‘‘ گنگناتا ہوا پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

دیوار گیروں پر چنے ہوئے برتن اس لڑکے کو ایک غیر مختتم ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ پانی کے نل سے روزانہ ایک ہی واقعہ دیکھ کر قطروں کی صورت میں آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بجلی کا قمقمہ حیرت سے اُس لڑکے کی طرف دیکھ رہا تھا—— کمرے کی فضا سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم

ہو رہی تھی۔

"قاسم —— قاسم۔"

"جی آیا صاحب۔" لڑکا جو انہی الفاظ کی گردان کر رہا تھا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

انسپکٹر صاحب نے کمبل سے منہ نکالا۔ اور لڑکے پر خفا ہوتے ہوئے کہا۔ "بیوقوف کے بچے! آج پھر یہاں صراحی اور گلاس رکھنا بھول گیا ہے۔

"ابھی لایا صاحب —— ابھی لایا صاحب۔"

کمرے میں صراحی اور گلاس رکھنے کے بعد وہ ابھی برتن صاف کرنے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ پھر اُس کمرے سے آواز آئی:۔

"قاسم —— قاسم۔"

"جی آیا صاحب۔" قاسم بھاگتا ہوا اپنے آقا کے پاس گیا۔

"بمبئی کا پانی کس قدر خراب ہے —— جاؤ پارسی کے ہوٹل سے سوڈا لے کر آؤ۔ بس بھاگے ہوئے جاؤ —— سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

قاسم بھاگا ہوا گیا۔ اور پارسی کے ہوٹل سے جو گھر سے قریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سوڈے کی بوتل لے آیا۔ اور اپنے آقا کو گلاس میں ڈال کر دیدی۔

"اب تم جاؤ۔ مگر اس وقت تک کیا کر رہے ہو۔ برتن صاف نہیں ہوئے کیا؟"

"ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

اور ہاں برتن صاف کرنے کے بعد میرے سیاہ بوٹ کو پالش کر دینا مگر دیکھنا احتیاط رہے۔ چمڑے پر کوئی خراش نہ آئے۔ ورنہ ——"

قاسم کو "ورنہ" کے بعد کا جُملہ بخوبی معلوم تھا۔ "بہت اچھا صاحب۔" کہتے ہوئے وہ باورچی خانے میں واپس چلا گیا۔ اور برتن صاف کرنے شروع کر دیے۔

اب نیند اُس کی آنکھوں میں سمٹی چلی آ رہی تھی۔ پلکیں آپس میں ملی جا رہی تھیں۔ سر میں سیسہ اُتر رہا تھا —— یہ خیال کرتے ہوئے کہ صاحب کے بوٹ بھی ابھی پالش کرنے ہیں۔ قاسم نے اپنے سر کو زور سے جُنبش دی۔ اور وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔

"جی آیا صاحب، جی آیا صاحب! بوٹ ابھی صاف ہو جاتے ہیں صاحب۔"

مگر نیند کا طوفان ہزار بند باندھنے پر بھی نہ رُکا۔ اب اُسے محسوس ہونے لگا کہ نیند ضرور

غلبہ پا کر رہے گی۔ لیکن ابھی برتنوں کو دھو کر انہیں اپنی اپنی جگہ پر رکھنا باقی تھا۔ اس وقت ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں آیا۔ "بھاڑ میں جائیں برتن۔ اور چولھے میں جائیں بوٹ ـــ کیوں نہ تھوڑی دیر اسی جگہ پر سو جاؤں۔ اور پھر چند لمحات آرام کرنے کے بعد ـــــــ

اس خیال کو باغیانہ تصور کرتے ہوئے قاسم نے ترک کر دیا۔ اور برتنوں پر جلدی جلدی راکھ ملنا شروع کر دی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب نیند پھر غالب آئی تو اس کے جی میں آیا کہ اُبلتا ہوا پانی اپنے سر پر انڈیل لے۔ اور اس طرح اس غیر مرئی طاقت سے جو اس کے کام میں حارج ہو رہی تھی۔ نجات پا جائے ـــــ مگر اتنا حوصلہ نہ پڑا۔

بصد مشکل مُنہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اُس نے سب برتنوں کو بالآخر صاف کر ہی لیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب وہ آرام سے سو سکتا تھا۔ اور نیند ـــ وہ نیند، جس کے لئے اس کی آنکھیں اور دماغ اس شدّت سے انتظار کر رہے تھے۔ اب بالکل نزدیک تھی۔

باورچی خانے کی روشنی گُل کرنے کے بعد قاسم نے باہر برآمدے میں اپنا بستر بچھایا۔ اور لیٹ گیا۔ اور اس سے پہلے کہ نیند اُسے اپنے آرام دہ بازوؤں میں تھام لے۔ اس کے کان "بوٹ، بوٹ" کی آوازوں سے گونج اُٹھے۔

"بہت اچھا صاحب ـــــ ابھی پالش کرتا ہوں۔" بڑبڑاتا ہوا قاسم بستر پر سے اُٹھا۔ جیسے اُس کے آقا نے ابھی بوٹ روغن کرنے کے لئے حکم دیا ہے۔

ابھی قاسم بوٹ کا ایک پیر بھی اچھی طرح پالش کرنے نہ پایا تھا کہ نیند کے غلبے نے اُسے وہیں پر سُلا دیا۔

سورج کی خونیں کرنیں اس مکان کے شیشوں سے نمودار ہوئیں۔ ـــــ قاسم کی کتابِ حیات میں ایک اور پُر از مشقت باب کا اضافہ ہو گیا۔

صبح جب انسپکٹر صاحب نے اپنے نوکر کو باہر برآمدے میں بوٹوں کے پاس سویا ہوا دیکھا تو اُسے ٹھوکر مار کر جگاتے ہوئے کہا۔ "یہ سُور کی طرح یہاں بیہوش پڑا ہے۔ اور مجھے خیال تھا کہ اس نے بُوٹ صاف کر لئے ہونگے ـــــ نمک حرام! ـــــ ابے قاسم!"

"جی آیا صاحب۔"

قاسم کے مُنہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ اُس نے اپنے ہاتھ میں بوٹ صاف کرنے کا بُرش دیکھا۔ فوراً ہی اس معاملے کو سمجھتے ہوئے اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:-

''میں سو گیا تھا صاحب! مگر — مگر بوٹ ابھی پالش ہو جاتے ہیں صاحب —''

یہ کہتے ہوئے اس نے جلدی جلدی بوٹ کو برش سے رگڑنا شروع کر دیا۔

بوٹ پالش کرنے کے بعد اس نے اپنا بستر تہہ کیا۔ اور اسے اوپر کے کمرے میں رکھنے چلا گیا۔

''قاسم''

''جی آیا صاحب''

''قاسم بھاگا ہوا نیچے آیا۔ اور اپنے آقا کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو آج ہمارے یہاں مہمان آئینگے۔ اس لئے باورچی خانے کے تمام برتن اچھی طرح صاف کر رکھنا — فرش بھی دُھلا ہوا ہونا چاہئے اس کے علاوہ تمہیں ملاقاتی کمرے کی تصویروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی صاف کرنا ہوگا — سمجھے! مگر خیال رہے میری میز پر ایک تیز دھار چاقو پڑا ہوا ہے، اسے مت چھیڑنا! میں اب دفتر جا رہا ہوں۔ مگر یہ کام دو گھنٹے سے پہلے ہو جانا چاہئے۔''

''بہت بہتر صاحب۔''

انسپکٹر صاحب دفتر چلے گئے۔ قاسم باورچی خانہ صاف کرنے میں مشغول ہو گیا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد اُس نے باورچی خانے کے تمام کام کو ختم کر دیا۔ اور ہاتھ پاؤں صاف کرنے کے بعد جھاڑن لے کر ملاقاتی کمرے میں چلا گیا۔

وہ ابھی کرسیوں کو جھاڑن سے صاف کر رہا تھا کہ اس کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک تصویر سی کھچ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے گردوپیش برتن ہی برتن پڑے ہیں۔ اور پاس ہی راکھ کا ایک ڈھیر لگ رہا ہے۔ ہوا زوروں پر چل رہی ہے۔ جس سے وہ راکھ اُڑ اُڑ کر فضا کو خاکستری بنا رہی ہے۔ یکا یک اس ظلمت میں ایک سُرخ آفتاب نمودار ہوا۔ جس کی کرنیں خون آشام برچھیوں کی طرح ہر برتن کے سینے میں گھُس گئیں۔ زمین خون سے شرابور ہو گئی — فضا خوشی کے قہقہوں سے معمور ہو گئی۔

قاسم یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور اس وحشت ناک خواب سے بیدار ہو کر ''جی آیا صاحب، جی آیا صاحب۔'' کہتا ہوا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور منظر رقص کرنے لگا۔ اب اس کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے آپس میں کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ دفعتاً آندھی چلنی شروع ہوئی۔ جس کے ساتھ ہی ایک بدنما اور بھیانک دیو نمودار ہوا۔ جو ان سب لڑکوں کو نگل گیا —

قاسم نے خیال کیا کہ وہ دیو اس کے آقا کے ہم شکل تھا۔ گو قد و قامت کے لحاظ سے وہ اس سے کہیں بڑا تھا۔ اب اس دیو نے زور زور سے ڈکارنا شروع کیا ـــــ قاسم سر سے پیر تک لرز گیا۔

ابھی تمام کمرہ صاف کرنا تھا۔ اور وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ چنانچہ قاسم نے جلدی جلدی کرسیوں پر جھاڑن مارنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ کرسیوں کا کام ختم کرنے کے بعد میز صاف کرنے جا رہا تھا کہ اسے یکایک خیال آیا۔ ''آج مہمان آ رہے ہیں۔ خدا معلوم کتنے برتن صاف کرنے پڑینگے۔ اور یہ نیند کمبخت کتنی ستا رہی ہے ـــــ مجھ سے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا ـــــ''

یہ سوچتے وقت وہ میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پونچھ رہا تھا کہ اچانک اُسے قلمدان کے پاس ایک کھلا ہوا چاقو نظر آیا ـــــ وہی چاقو جس کے متعلق اس کے آقا نے کہا تھا کہ بہت تیز ہے۔

چاقو کا دیکھنا تھا کہ اس کی زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے ـــ چاقو ـــ تیز دھار چاقو! ـــ یہی تمہاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے۔''

کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اُٹھا کر اپنی انگلی پر پھیر لیا ـــ اب وہ شام کے وقت برتن صاف کرنے کی زحمت سے بہت دور تھا۔ اور نیند ـــــ پیاری، پیاری نیند اب اسے بآسانی نصیب ہو سکتی تھی۔

اُنگلی سے خون کی سُرخ دھار بہہ رہی تھی ـــــ سامنے والی دوات کی سُرخ روشنائی سے کہیں چمکیلی۔ قاسم اس خون کی دھار کو مسرّت بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور منہ میں یہ گنگنا رہا تھا۔ ''نیند، نیند ـــ پیاری نیند۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا جو زنانخانے میں بیٹھی سلائی کر رہی تھی۔ اور اپنی زخمی انگلی دکھا کر کہنے لگا ـــ ''دیکھئے بی بی جی ـــــ''

''ارے قاسم یہ تو نے کیا کیا؟ ـــ کمبخت صاحب کے چاقو کو چھیڑا ہوگا تو نے؟''

''بی بی جی ـــ بس میز صاف کر رہا تھا۔ اور اس نے کاٹ کھایا'' قاسم ہنس پڑا۔

''ابے سور اب ہنستا ہے، ادھر آ، میں اس پر کپڑا باندھ دوں، ـــــ مگر اب بتا تو سہی، آج یہ برتن تیرا باپ صاف کرے گا؟''

قاسم اپنی فتح پر زیرِ لب مُسکرا رہا تھا۔

انگلی پر پٹی بندھوا کر قاسم پھر کمرے میں آ گیا۔ اور میز پر پڑے ہوئے خون کے دھبوں کو صاف کرنے کے بعد خوشی خوشی اپنا کام ختم کر دیا۔

''اب اس نمک حرام باورچی کو برتن صاف کرنے ہونگے، ـــــ ضرور صاف کرنے

ہونگے —— کیوں میاں مٹھو؟ قاسم نے انتہائی مسرّت میں کھڑکی میں لٹکے ہوئے طوطے سے دریافت کیا۔

شام کے وقت مہمان آئے اور چلے گئے۔ باورچی خانے میں صاف کرنے والے برتنوں کا ایک طومار سا لگ گیا —— انسپکٹر صاحب قاسم کی زخمی اُنگلی دیکھ کر بہت برسے۔ اور جی کھول کر گالیاں دیں۔ مگر اسے مجبور نہ کر سکے —— شاید اس لئے کہ ایک بار اُن کی اپنی اُنگلی میں قلم تراش کی نوک چُبھ جانے سے بہت درد محسوس ہوا تھا۔

آقا کی خفگی آنے والی مسرّت نے بھلا دی۔ اور قاسم کودتا پھاندتا ہوا اپنے بستر میں جا لیٹا۔ تین چار روز تک وہ برتن صاف کرنے کی زحمت سے بچا رہا۔ مگر اس کے بعد اُنگلی کا زخم بھر آیا —— اب پھر وہی مصیبت نمودار ہوگئی۔

قاسم —— صاحب کی جرابیں اور قمیض دھو ڈالو۔"

"بہت اچھا بی بی جی۔"

"قاسم اس کمرے کا فرش کتنا بدنما ہو رہا ہے۔ پانی لا کر ابھی صاف کر دو —— دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے ——"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں۔ انہیں نمک سے صاف کرو۔"

"جی اچھا صاحب"۔

"قاسم! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے۔ اسے صاف کیوں نہیں کرتے؟"

ابھی کرتا ہوں بی بی جی۔"

"قاسم! ابھی خاکروب آتا ہے۔ تم پانی ڈالتے جانا۔ وہ سیڑھیوں کو دھو ڈالے گا۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

"قاسم! ذرا بھاگ کے ایک آنے کا دہی تو لے آنا۔"

"ابھی چلا بی بی جی۔"

پانچ چھ روز اسی قسم کے احکام سُننے میں گذر گئے۔ قاسم کام کی زیادتی اور آرام کے قحط سے تنگ آ گیا۔ ہر روز اسے نصف شب تک کام کرنا پڑتا۔ اور پھر علی الصباح چار بجے کے قریب بیدار ہو کر ناشتے کے لئے چائے تیار کرنا پڑتی۔ یہ کام قاسم کی عمر کے لڑکے کے لئے بہت زیادہ تھا۔

ایک روز انسپکٹر صاحب کی میز صاف کرتے وقت اس کے ہاتھ خود بخود چاقو کی طرف

بڑھے۔ اور ایک لمحے کے بعد اس کی اُنگلی سے خون بہہ رہا تھا—— انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی قاسم کی یہ حرکت دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔ چنانچہ سزا کی صورت میں اسے شام کا کھانا نہ دیا گیا۔ مگر وہ اپنی ایجادہ ترکیب کی خوشی میں مگن تھا—— ایک وقت روٹی نہ ملی۔ اُنگلی پر معمولی سا زخم آ گیا۔ مگر برتنوں کا انبار صاف کرنے سے نجات مل گئی—— یہ سودا کچھ بُرا نہ تھا۔

چند دنوں کے بعد اُس کی اُنگلی کا زخم ٹھیک ہو گیا۔ اب پھر کام کی وہی بھرمار شروع تھی۔ پندرہ بیس روز گدھوں کی سی مشقت میں گذر گئے۔ اس عرصے میں قاسم نے بارہا ارادہ کیا کہ چاقو سے پھر اپنی اُنگلی زخمی کر لے۔ مگر اب میز پر سے وہ چاقو اٹھا لیا گیا۔ اور باورچی خانے والی چھری کند تھی۔

ایک روز باورچی بیمار پڑ گیا۔ اب اُسے ہر وقت باورچی خانے میں موجود رہنا پڑتا۔ کبھی مرچیں پیستا۔ کبھی آٹا گوندھتا۔ کبھی کوئلوں کو جلا دیتا۔ غرض صبح سے لے کر آدھی رات تک اُس کے کانوں میں ”اے قاسم یہ کر، اے قاسم وہ کر۔“ کی صدا گونجتی رہتی۔

باورچی دو روز تک نہ آیا— قاسم کی ننھی جان اور ہمت جواب دے گئی۔ مگر سوائے کام کے اور چارہ ہی کیا تھا؟

ایک روز اس کے آقا نے اسے الماری صاف کرنے کو کہا۔ جس میں ادویات کی شیشیاں اور مختلف چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ الماری صاف کرتے وقت اسے ڈاڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ نظر آیا۔ بلیڈ کو پکڑتے ہی اس نے اپنی اُنگلی پر پھیر لیا۔ دھار تھی بہت تیز اور باریک، اُنگلی میں دور تک چلی گئی۔ جس سے بہت بڑا زخم بن گیا۔

قاسم نے بہت کوشش کی۔ یہ خون نکلنا بند ہو جائے۔ مگر زخم کا منہ بڑا تھا۔ وہ نہ تھما— سیروں خون پانی کی طرح بہہ گیا۔ یہ دیکھ کر قاسم کا رنگ کاغذ کی مانند سپید ہو گیا۔ بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔

”بی بی جی، میری اُنگلی میں صاحب کا اُسترا لگ گیا ہے۔“

جب انسپکٹر صاحب کی بیوی نے قاسم کی اُنگلی کو تیسری مرتبہ زخمی دیکھا۔ فوراً معاملے کو سمجھ گئی۔ چپ چاپ اُٹھی اور کپڑا نکال کر اُس کی اُنگلی پر باندھ دیا۔ اور کہا۔ ”قاسم! اب تم ہمارے گھر میں نہیں رہ سکتے۔“

”وہ کیوں بی بی جی؟“

”یہ صاحب سے دریافت کرنا۔“

صاحب کا نام سنتے ہی قاسم کا رنگ اور بھی سپید ہو گیا۔

چار بجے کے قریب انسپکٹر صاحب دفتر سے گھر آئے اور اپنی بیوی سے قاسم کی نئی حرکت سن کر اُسے فوراً اپنے پاس بلایا۔

''کیوں میاں یہ انگلی کو ہر روز زخمی کرنے کے کیا معنی ہیں''؟

قاسم خاموش کھڑا رہا۔

''تم نوکر یہ سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اندھے ہیں۔ اور ہمیں بار بار دھوکہ دیا جا سکتا ہے — اپنا بستر بوریہ دبا کر ناک کی سیدھ میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہمیں تم جیسے نوکروں کی کوئی ضرورت نہیں — سمجھے۔''

''مگر — مگر صاحب۔''

''صاحب کا بچہ — بھاگ جا یہاں سے، تیری بقایا تنخواہ کا ایک پیسہ بھی نہیں دیا جائے گا — اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا —''

قاسم روتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ طوطے کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ طوطے نے بھی خاموشی میں اس سے کچھ کہا اور اپنا بسترہ لے کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ مگر دفعتاً کچھ خیال آیا۔ اور بھاگا ہوا اپنے آقا کی بیوی کے پاس گیا۔ اور دردانگیز آواز میں اتنا کہہ کر'' سلام بی بی جی — میں ہمیشہ کے لئے آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔'' وہاں سے رخصت ہو گیا۔

خیراتی ہسپتال میں ایک نوخیز لڑکا درد کی شدّت سے لوہے کے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ پاس ہی دو ڈاکٹر بیٹھے ہیں۔ اُن میں سے ایک ڈاکٹر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا — ''زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا ہے — ہاتھ کاٹنا پڑے گا۔''

''بہت بہتر۔''

یہ کہتے ہوئے دوسرے ڈاکٹر نے اپنی نوٹ بک میں اس مریض کا نام درج کر لیا — ایک چوبی تختے پر جو چارپائی کے سرہانے لٹکا ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے۔

نام:- محمد قاسم ولد عبدالرحمٰن (مرحوم)

عمر:- دس سال۔

☆☆

پھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلّی نے بچے دیئے تھے جو بلّا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کُتیا نے بچے دیئے تھے جو بڑے بڑے ہوگئے تھے اور دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا — ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی — ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔

جانے کتنے برس گزر چکے تھے — کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیونتی، کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلّیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بدعادت مرغیاں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح اٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا — اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا، پھنسا ہوا تھا اس زور سے قاتل نے پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہوگئی تھی — اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں، ایسا کیونکر ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے، نہیں بلّیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی — کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ مکیشی — جھلمل جھلمل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں، اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا — سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی مشکیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنہیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے — پر جب صبح ہوئی تھی تو ان

کا نام و نشان تک نہیں تھا — سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی، کم بخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا — جو بڑا اگل گوتھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مرگئی —— باپ بھی — دونوں کو بچے نے مارا — اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے جو اسے گھورتے تھے، اس کو چھچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں — مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہوگئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے — نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں — کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا ان کتوں میں دو زہر کھا کے مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان ملازمہ کی جگہ آئی تھی جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا، گلے میں اس کے پھندنوں والے ازاربند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی۔ اور بد عادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔

آملیٹ بناتی تھی جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی — پاکستان میل موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل۔ بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی ہوئی تھیں — پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا بلاؤز اتارا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ اس کے دودھ اُبلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہوگئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ اُبلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ مل مل کے گنگنے ہوگئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا۔ مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچانے نہ آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برتن تھے، چھوٹے اور بڑے، جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی — دھیمی اور گرجدار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا — ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ بیچاری کو اپنی شادی یاد آ گئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ روتی رہی، وہ ہنستا رہا — صبح ہوئی تو ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسا دینے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلایا گیا — اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا ازار بند پڑا تھا — معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں — اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا۔ مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں — ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے — باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسا دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے۔ اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھابی، دونوں سیر کو جاتی ہیں — سہیلی بھی، پاکستان میل۔ موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل — سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال، پیلے، ہرے، نیلے — سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوور کوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل و صورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے — اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلّانے لگتی ہیں۔

تینوں اجنتا میں تجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت

کے دو پیٹ ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے — دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے۔ جنی گئی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔

مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے — بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔

ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی اسٹینوگرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجنتا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں اس کے بکھیرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔

اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر — ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس سے بھرا ہوا مرتبان — اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔

فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں — دولہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن ہی کے ہاں رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی، لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بند ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں سے بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔

اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی

اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لئے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب وغریب مٹھاس میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی سہیلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی، اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہڑ کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئی تھی۔ اس پر شہد کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بے ہوش ہوگئی۔ معلوم نہیں بیہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی اسٹینوگرافر کا سر سہلاتا تھا۔

اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔

اب اس کو ڈرائیونگ آگئی تھی مگر بہت بیمار ہوگئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے پلّے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہوگئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جبکہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کتاب کر رہے تھے، اس کی بھابی نمودار ہوئی وہ مجرّد تھی——اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صبح کمرے میں سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیئے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب وغریب مٹھاس میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی، مگر ناکام رہی۔ اس لئے کہ مقدار کم تھی——اس نے مقدار بڑھا دی۔ حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی——لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی۔ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جسم کا ذرہ ذرہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے، ان قبروں میں جو ان کے لئے بن سکتی تھیں، اس دودھ کے لئے جو ان کا ہو سکتا تھا بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ مگر اس کے دودھ کہاں تھے——وہ تو

جنگلی بلے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ ذہین تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکھلی ہوگئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے —— وہ سمجھ گئی، چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی —— رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لئے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہوگیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا۔ موٹر گراج میں اور اس کی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، دوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے مگر اس بدذائقہ سے تو اس کے بچے کے ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئٹیزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے۔ نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے، چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہوگئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مر گئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے، اس نے علیحدہ کر دیئے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے ایک آیا رکھ دی —— کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی تھی ”چلے جاؤ —— جو کوئی بھی تم ہو، چلے جاؤ —— میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔“

سیلف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے

جن سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کن سری آواز میں فحش گانے گاتی تھی آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لئے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ پئے اور خوب پئے، اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے — مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گئی تھی۔

تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی — ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔ وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پئے، آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا — آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا —— ایک آدمی چھرا ہاتھ میں لئے، منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر کا —— آخر جو رستہ ملا، اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ چیختی، پکارتی: ''ٹھہرو — ٹھہرو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی — ٹھہرو!'' مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی — اچانک اس کی نظریں آئینے سے دو چار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا، وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس میں خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی — وہ کئی

بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلو بند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔

دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلو بند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے—وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں— تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

☆☆

دس روپے

وہ گلی کی اس نکڑ پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی اور اس کی ماں اسے چالی (بڑا مکان جس میں کئی منزلیں اور کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہوتے ہیں) میں ڈھونڈ رہی تھی۔ کشوری کو اپنی کھولی میں بٹھا کر اور باہر والے سے کافی ملی چائے لانے کے لئے کہہ کر وہ اس چالی کی تینوں منزلوں میں اپنی بیٹی کو تلاش کر چکی تھی۔ مگر جانے وہ کہاں مر گئی تھی۔ سنڈاس کے پاس جا کر بھی اس نے آواز دی۔ ”اے سریتا...... سریتا!“ مگر وہ تو چالی میں تھی ہی نہیں اور جیسا کہ اس کی ماں سمجھ رہی تھی۔ اب اسے پیچش کی شکایت بھی نہیں تھی۔ دوا پئے بغیر اس کو آرام آ چکا تھا۔ اور وہ باہر گلی کے اس نکڑ پر جہاں کچڑے کا ڈھیر پڑا رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے کھیل رہی تھی اور ہر قسم کے فکر و تردد سے آزاد تھی۔

اس کی ماں بہت متفکر تھی۔ کشوری اندر کھولی میں بیٹھا تھا اور جیسا کہ اس نے کہا تھا۔ دو سیٹھ باہر بڑے بازار میں موٹر لئے کھڑے تھے۔ لیکن سریتا کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ موٹر والے سیٹھ ہر روز تو آتے نہیں، یہ تو کشوری کی مہربانی ہے کہ مہینے میں ایک دو بار موٹی آسامی لے آتا ہے۔ ورنہ ایسے گندے محلّے میں جہاں پان کی پیکوں اور جلی ہوئی بیڑیوں کی ملی جلی بو سے کشوری گھبراتا ہے۔ سیٹھ لوگ کیسے آ سکتے ہیں۔ کشوری چونکہ ہوشیار ہے۔ اس لئے وہ کسی آدمی کو مکان پر نہیں لاتا بلکہ سریتا کو کپڑے وپڑے پہنا کر باہر لے جایا کرتا تھا اور ان لوگوں سے کہہ دیا کرتا تھا کہ صاحب آج کل زمانہ بڑا نازک ہے۔ پولیس کے سپاہی ہر وقت گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اب تک دو سو دھندا کرنے والی چھوکریاں پکڑی جا چکی ہیں۔ کورٹ میں میرا بھی ایک کیس چل رہا ہے۔ اس لئے پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔“

سریتا کی ماں کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ جب وہ نیچے اُتری تو سیڑھیوں کے پاس رام دئی بیٹھی بیڑیوں کے پتے کاٹ رہی تھی۔ اس سے سریتا کی ماں نے پوچھا۔ ”تو نے سریتا کو کہیں دیکھا

ہے۔ جانے کہاں مرگئی ہے۔ بس آج مجھے مل جائے۔ وہ چار چوٹ کی ماروں کہ بند بند ڈھیلا ہو جائے...... لوتھا کی لوتھا ہو گئی ہے۔ پر سارا دن لونڈوں کے ساتھ کدکڑے لگاتی رہتی ہے"۔

رام دئی بیڑیوں کے پتے کاٹتی رہی اور اس نے سریتا کی ماں کو جواب نہ دیا۔ دراصل رام دئی سے سریتا کی ماں نے خاص طور پر کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ وہ یونہی بڑبڑاتی ہوئی اس کے پاس سے گزر گئی جیسا کہ اس کا عام دستور تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اسے سریتا کو ڈھونڈنا پڑتا تھا اور رام دئی کو جو کہ سارا دن سیڑھیوں کے پاس پٹاری سامنے رکھے بیڑیوں پر لال اور سفید دھاگے لپیٹتی رہی تھی مخاطب کر کے یہی الفاظ دہرایا کرتی تھی۔

ایک اور بات وہ چالی کی ساری عورتوں سے کہا کرتی تھی۔ میں تو اپنی سریتا کا کسی بابو سے بیاہ کروں گی۔ اسی لئے تو اس سے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لکھ لے۔

یہاں پاس ہی ایک اسکول منسی پالٹی (میونسپلٹی) نے کھولا ہے، سوچتی ہوں اس میں سریتا کو داخل کرادوں، بہن اس کے پتا کو بڑا شوق تھا کہ میری لڑکی پڑھی لکھی ہو...... اس کے بعد وہ ایک لمبی آہ بھر کر عام طور پر اپنے مرے ہوئے شوہر کا قصہ چھیڑ دیتی تھی جو چالی کی ہر عورت کو زبانی یاد تھا۔ رام دئی سے اگر آپ پوچھیں کہ اچھا جب سریتا کے باپ کو جو ریلوائی میں کام کرتا تھا۔ بڑے صاحب نے گالی دی تو کیا ہوا تو رام دئی فوراً آپ کو بتا دے گی کہ سریتا کے باپ کے منہ میں جھاگ بھر آیا اور وہ صاحب سے کہنے لگا۔ "میں تمہارا نوکر نہیں ہوں، سرکار کا نوکر ہوں۔ تم مجھ پر رُعب نہیں جما سکتے۔ دیکھو اگر پھر گالی دی تو یہ دونوں جبڑے حلق کے اندر کر دوں گا"۔ بس پھر کیا تھا۔ صاحب تاؤ میں آگیا اور اس نے ایک اور گالی سنا دی۔ اس پر سریتا کے باپ نے غصے میں آکر صاحب کی گردن پر ایسی دھول جمائی کہ اس کا ٹوپ دس گز پرے جا گرا اور اس کو دن میں تارے نظر آگئے۔ مگر پھر بھی وہ بڑا آدمی تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے سریتا کے باپ کے پیٹ میں اپنے فوجی بوٹ سے اس زور کی ٹھوکر ماری کہ اس کی تلی پھٹ گئی اور وہیں لائنوں کے پاس گر کر اس نے جان دے دی۔ سرکار نے صاحب پر مقدمہ چلایا اور پورے پانچ سو روپے سریتا کی ماں کو اس سے دلوائے مگر قسمت بری تھی۔ اس کو سٹہ کھیلنے کی چاٹ پڑ گئی اور پانچ مہینے کے اندر اندر سارا روپیہ برباد ہو گیا۔

سریتا کی ماں کی زبان پر ہر وقت یہ کہانی جاری رہتی تھی لیکن کسی کو یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ۔ چالی میں سے کسی آدمی کو بھی سریتا کی ماں سے ہمدردی نہ تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ سب کے سب خود ہمدردی کے قابل تھے، کوئی کسی کا دوست نہیں تھا۔ اس بلڈنگ میں اکثر آدمی ایسے

رہتے تھے جو دن کو سوتے تھے اور رات کو جاگتے تھے۔ کیونکہ انہیں رات کو پاس والی مل میں کام پر جانا ہوتا تھا۔ اس بلڈنگ میں سب آدمی بالکل پاس پاس رہتے تھے۔ لیکن کسی کو ایک دوسرے سے دلچسپی نہ تھی۔

چالی میں قریب قریب سب لوگ جانتے تھے کہ سریتا کی ماں اپنی جوان بیٹی سے پیشہ کراتی ہے لیکن چونکہ وہ کسی کے ساتھ اچھا برا سلوک کرنے کے عادی ہی نہ تھے۔ اس لیے سریتا کی ماں کو کوئی جھٹلانے کی کوشش نہ کرتا تھا۔ جب وہ کہا کرتی تھی۔ میری بیٹی کو تو دنیا کی کچھ خبر ہی نہیں۔

البتہ ایک روز صبح سویرے نل کے پاس جب تکارام نے سریتا کو چھیڑا تھا تو سریتا کی ماں بہت چیخی چلائی تھی۔ "اس موئے گنجے کو تو کیوں سنبھال کے نہیں رکھتی۔ پرماتما کرے دونوں آنکھوں سے اندھا ہو جائے جن سے اس نے میری کنواری بیٹی کی طرف بری نظروں سے دیکھا...... سچ کہتی ہوں ایک روز ایسا فساد ہوگا کہ اس تیری سوغات کا مارے جوتوں کے سر پلپلا کر دوں گی...... باہر جو چاہے، جھک مارے پر یہاں اسے بھلے مانسوں کی طرح رہنا ہوگا۔ سنا!"

اور یہ سن کر تکارام کی بھینگی بیوی دھوتی باندھتے باندھتے باہر نکل آئی تھی۔ "خبردار موئی چڑیل جو تو نے ایک لفظ بھی اور زبان سے نکالا...... یہ تیری دیوی تو ہوٹل کے چھوکروں سے بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہے اور تو کیا ہم سب کو اندھا سمجھتی ہے کیا، ہم سب جانتے ہیں کہ تیرے گھر میں نت نئے بابو کس لئے آتے ہیں اور یہ تیری سریتا آئے دن بن سنور کر باہر کیوں جاتی ہے...... بڑی آئی عزت آبرو والی...... جا جا دور دفع ہو یہاں سے"۔

تکارام کی بھینگی بیوی کے متعلق بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ لیکن یہ بات خاص طور پر سب لوگوں کو معلوم تھی کہ گھانس لیٹ والا (مٹی کا تیل بیچنے والا) تیل دینے کے لئے آتا ہے تو وہ اسے اندر بلا کر دروازہ بند کر لیا کرتی ہے۔ چنانچہ سریتا کی ماں نے اس خاص بات پر بہت زور دیا۔ وہ بار بار نفرت بھرے لہجے میں اس سے کہتی۔ "اور وہ تیرا یار گھانس لیٹ والا...... دو دو گھنٹے اسے کھولی میں بٹھا کر تو اس کا گھانس لیٹ سونگھتی رہتی ہے؟"۔

تکارام کی بیوی سے سریتا کی ماں کی بول چال زیادہ دیر تک بند نہ رہتی تھی، کیونکہ ایک روز سریتا کی ماں نے رات کو اپنی پڑوسن کو گھپ اندھیرے میں کسی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتے پکڑ لیا تھا اور دوسرے ہی روز تکارام کی بیوی نے جب وہ رات کو پائے دھونی کی طرف آ رہی تھی۔ سریتا کو ایک "جنٹل مین آدمی" کے ساتھ موٹر میں بیٹھے دیکھ لیا۔ چنانچہ ان دونوں کا آپس میں سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ اسی لئے سریتا کی ماں نے تکارام کی بیوی سے پوچھا۔ "تو نے کہیں سریتا کو نہیں دیکھا؟"۔

تکارام کی بیوی نے بھینگی آنکھ سے گلی کے نکڑ کی طرف دیکھا ''وہاں گھورے کے پاس پنواریوں کی لونڈیا سے کھیل رہی ہے۔'' پھر اس نے دھیمی آواز کر کے اس سے کہا۔ ''ابھی ابھی کشوری اُوپر گیا تھا، کیا تجھ سے ملا؟''۔

سریتا کی ماں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ''اُوپر بٹھا آئی ہوں پر یہ سریتا ہمیشہ وقت پر کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ کچھ سوچتی نہیں، کچھ سمجھتی نہیں۔ بس دن بھر کھیل کود چاہئے۔'' یہ کہہ کر وہ گھورے کی طرف بڑھی اور جب سیمنٹ کی بنی ہوئی موتری (پیشاب گاہ) کے پاس آئی تو سریتا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اس کی ماں نے خشم آلود لہجے میں اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''چل گھر میں چل مر...... تجھے تو سوائے اُچھل کود کے اور کوئی کام ہی نہیں۔'' پھر راستے میں اس نے ہولے سے کہا۔ ''کشوری بڑی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔ ایک موٹر والے سیٹھ کو لایا ہے...... چل تو بھاگ کر اُوپر چل اور جلدی جلدی تیار ہو جا...... اور سن...... وہ نیلی جارجٹ کی ساڑھی پہنیو...... اور دیکھ یہ تیرے بال بھی بہت بُری طرح بکھرے ہیں...... تو جلدی سے تیار ہو، کنگھی میں کر دوں گی''۔

یہ سن کر موٹر والے سیٹھ آئے ہیں۔ سریتا بہت خوش ہوئی۔ اسے سیٹھ سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ جتنی کہ موٹر سے تھی۔ موٹر کی سواری اسے بہت پسند تھی۔ جب موٹر فراٹے بھرتی کھلی کھلی سڑکوں پر چلتی اور اس کے منہ پر ہوا کے طمانچے پڑتے، تو اس کو ہر شئے ایک ہوائی چکر دکھائی دیتی اور سمجھتی کہ وہ خود ایک بگولا ہے جو سڑکوں پر اُڑتا چلا جا رہا ہے۔

سریتا کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی ہوگی۔ مگر اس میں بچپنا تیرہ برس کی لڑکیوں کا سا تھا۔ عورتوں سے ملنا جلنا اور ان سے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ سارا دن چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ اُوٹ پٹانگ کھیلوں میں مصروف رہتی۔ ایسے کھیل جن کا کوئی مطلب ہی نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ گلی کے کالے لُک پھرے فرش پر کھریا مٹی سے لکیریں کھینچنے میں بہت دلچسپی لیتی تھی اور اس کھیل میں وہ اس انہماک سے مصروف رہتی جیسے سڑک پر یہ ٹیڑھی بنگی لکیریں اگر نہ کھینچی گئیں تو آمدورفت بند ہو جائے گی اور پھر کھولی سے پرانے ٹاٹ اٹھا کر وہ اپنی ننھی ننھی سہیلیوں کے ساتھ کئی کئی گھنٹے ان کو فٹ پاتھ پر جھٹکنے صاف کرنے، بچھانے اور بیٹھنے کے غیر دلچسپ کھیل میں مشغول رہتی تھی۔

سریتا خوبصورت نہیں تھی۔ رنگ اس کا سیاہی مائل گندمی تھا۔ بمبئی کے مرطوب موسم کے باعث اس کے چہرے کی جلد ہر ممکن چکنی رہتی تھی اور پتلے پتلے ہونٹوں پر جو چیکو کے ایک پھل جس

کا رنگ گندمی ہوتا ہے، چھلکے دکھائی دیتے تھے۔ ہر وقت خفیف سی لرزش طاری رہتی تھی اوپر کے ہونٹ پر پسینے کی تین چار ننھی بوندیں کپکپاتی رہتی تھیں۔ اس کی صحت اچھی تھی۔ غلاظت میں رہنے کے باوجود اس کا جسم سڈول اور متناسب تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر جوانی کا حملہ بڑی شدت سے ہوا ہے جس نے مخالف قوتوں کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ قد چھوٹا تھا جو اس کی تندرستی میں اضافہ کرتا تھا۔ سڑک پر پھرتی سے اِدھر اُدھر چلتے ہوئے جب اس کی میلی گھگری اوپر کو اُٹھ جاتی تو کئی راہ چلنے والے مردوں کی نگاہیں اس کی پنڈلیوں کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ جن میں جوانی کے باعث تازہ رندہ کی ہوئی ساگوان کی لکڑی جیسی چمک دکھائی دیتی تھی (ان پنڈلیوں پر جو بالوں سے بالکل بے نیاز تھیں۔ مساموں کے ننھے ننھے نشان دیکھ کر ان سنگتروں کے چھلکے یاد آ جاتے تھے۔ جن کے چھوٹے چھوٹے خلیوں میں تیل بھرا ہوتا ہے اور جو تھوڑے سے دباؤ پر فوارے کی طرح اُوپر اٹھ کر آنکھوں میں گھس جایا کرتا ہے)

سریتا کی باہیں بھی سڈول تھیں۔ کندھوں پر ان کی گولائی موٹی اور بڑے بیڈھب طریقے پر سلے ہوئے بلاؤز کے باوجود باہر جھانکتی تھی بال بڑے گھنے اور لمبے تھے۔ ان میں سے کھوپرے کے تیل کی بو آتی رہتی تھی۔ ایک موٹے کوڑے کی مانند اس کی چوٹی پیٹھ کو تھپکتی رہتی تھی۔ سریتا اپنے بالوں کی لمبائی سے خوش نہیں تھی۔ کیونکہ کھیل کود کے دوران میں اس کی چوٹی اسے بہت تکلیف دیا کرتی تھی۔ اور اسے مختلف طریقوں سے اس کو قابو میں رکھنا پڑتا تھا۔

سریتا کا دل و دماغ ہر قسم کے فکر و تردّد سے آزاد تھا۔ دونوں وقت اسے کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کی ماں گھر کا سب کام کاج کرتی تھی۔ صبح کو سریتا بالٹیاں پانی سے بھر کر اندر رکھ دیتی اور شام کو ہر روز لیمپ میں ایک پیسے کا تیل بھروا لاتی۔ کئی برسوں سے وہ یہ کام بڑی باقاعدگی سے کر رہی تھی۔ چنانچہ شام کو عادت کے باعث خود بخود اس کا ہاتھ اس پیالے کی طرف بڑھتا جس میں پیسے پڑے رہتے تھے اور لیمپ اٹھا کر وہ نیچے چلی جاتی۔

کبھی کبھی یعنی مہینے میں چار پانچ بار جب کشوری سیٹھ لوگوں کو لاتا تھا تو ان کے ساتھ ہوٹل میں یا باہر اندھیرے مقاموں پر جانے کو وہ تفریح خیال کرتی تھی۔ اس نے اس باہر جانے کے سلسلے میں دوسرے پہلوؤں پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ شاید یہ سمجھتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کے گھر میں بھی کشوری جیسے آدمی آتے ہوں گے اور ان کو سیٹھ لوگوں کے ساتھ باہر جانا پڑتا ہوگا اور وہاں رات کو ورلی کے ٹھنڈے بنچوں پر یا جوہو کی گیلی ریت پر جو کچھ ہوتا ہے سب کے ساتھ ہوتا ہوگا چنانچہ اس نے ایک بار اپنی ماں سے کہا تھا "ماں اب تو شانتا بھی کافی بڑی ہوگئی۔ اس کو بھی

میرے ساتھ بھیج دو نا۔ یہ سیٹھ جو آب آئے ہیں مجھے انڈے کھانے کو دیا کرتے ہیں۔ اور شانتا کو انڈے بہت بھاتے ہیں'' اس پر اس کی ماں نے بات گول مول کر دی تھی۔ ہاں ہاں کسی روز اس کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں گی۔ اس کی ماں پونے سے واپس تو آ جائے۔ اور سریتا نے دوسرے روز ہی شانتا کو جب وہ سنڈاس سے نکل رہی تھی یہ خوشخبری سنائی تھی '' تیری ماں پونہ سے آ جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا تو بھی میرے ساتھ ورلی جایا کرے گی۔'' اور اس کے بعد سریتا نے رات کی بات اس کو کچھ اس طریقے پر سنانا شروع کی تھی جیسے اس نے ایک نہایت ہی پیارا سپنا دیکھا ہے۔ شانتا کو جو سریتا سے دو برس چھوٹی تھی۔ یہ باتیں سن کر ایسا لگا تھا جیسے اس کے سارے جسم کے اندر ننھے ننھے گھنگھرو بج رہے ہیں۔ سریتا کی سب باتیں سن کر بھی اس کو تسلی نہ ہوئی تھی اور اس کا بازو کھینچ کر اس نے کہا تھا '' چل نیچے چلتے ہیں'' ……… وہاں باتیں کریں گے۔ اور نیچے اس موتری کے پاس جہاں گردھاری بنیا نے بہت سے ٹاٹوں پر کھوپرے کے میلے ٹکڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے تھے۔ وہ دونوں دیر تک گدگدی پیدا کرنے والی باتیں کرتی رہی تھیں۔ اس وقت بھی جب کہ سریتا دھوتی کے پردے پیچھے نیلی جارجٹ کی ساڑی پہن رہی تھی۔ کپڑے کے مس ہی سے اس کے بدن پر گدگدی ہو رہی تھی اور موٹر کی سیر کا خیال اس کے دماغ میں پرندوں کی سی پھڑ پھڑاہٹیں پیدا کر رہا تھا۔ اب کی بار سیٹھ کیسا ہوگا اور اسے کہاں لے جائے گا۔ یہ اور اسی قسم کے اور سوال اس کے دماغ میں نہیں آ رہے تھے البتہ جلدی جلدی کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک دو مرتبہ یہ ضرور سوچا تھا کہ ایسا نہ ہو موٹر چلے اور چند ہی منٹوں میں کسی ہوٹل کے دروازے پر ٹھہر جائے۔ اور ایک بند کمرے میں سیٹھ شراب پینا شروع کر دے اور اس کا دم گھٹنا شروع ہو جائے۔ اسے ہوٹلوں کے بند کمرے پسند نہیں تھے جن میں عام طور پر لوہے کی دو چار پائیاں اس طور پر بچھی ہوئی تھیں گویا ان پر جی بھر کے سونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

جلدی جلدی اس نے جارجٹ کی ساڑھی پہنی اور اس کی شکنیں درست کرتی ہوئی ایک لمحے کے لئے کشوری کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ کشوری ذرا دیکھو……… پیچھے سے ساڑی ٹھیک ہے نا؟ اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہ لکڑی کے اس ٹوٹے ہوئے بکس کی طرف بڑھی جس میں اس نے جاپانی پاؤڈر اور جاپانی سرخی رکھی ہوئی تھی……… ایک دھندلے آئینے کو کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا کر اس نے دوہری ہو کر اپنے گالوں پر پاؤڈر ملا اور سرخی لگا کر جب بالکل تیار ہو گئی تو مسکرا کر کشوری کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا۔

شوخ رنگ کی نیلی ساڑی میں ہونٹوں پر بے ترتیبی سے سرخی کی دھڑی جمائے اور

سانولے گالوں پر پیازی رنگ کا پاؤڈر ملے وہ مٹی کا ایک ایسا کھلونا معلوم ہوئی جو دیوالی پر کھلونے بیچنے والوں کی دکان میں سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیا کرتا ہے۔

اتنے میں اس کی ماں آگئی۔ اس نے جلدی جلدی سریتا کے بال درست کئے اور کہا۔ دیکھو بیٹا اچھی اچھی باتیں کرنا............ اور جو کچھ وہ کہیں مان لینا............ سیٹھ جو آئے ہیں نا بڑے آدمی ہیں، موٹر ان کی اپنی ہے............ پھر کشوری سے مخاطب ہو کر کہا اب تو جلدی سے لے جا اسے۔ بیچارے کب سے کھڑے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

(باہر بڑے بازار میں جہاں ایک کارخانے کی لمبی سی دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ ایک پیلے رنگ کی موٹر "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" کے چھوٹے سے بورڈ کے پہلو میں کھڑی تھی اور موٹر میں تین حیدر آبادی نوجوان اپنی اپنی ناک پر رومال رکھے کشوری کا انتظار کر رہے تھے) ۔ وہ موٹر آگے لے جاتے مگر مصیبت یہ ہے کہ دیوار دور تک چلی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پیشاب کا سلسلہ بھی۔ جب گلی کے موڑ سے اس نوجوان کو جو موٹر کا ہینڈل تھامے بیٹھا تھا کشوری نظر آیا تو اس نے اپنے باقی دو ساتھیوں سے کہا "لو بھئی آگئے............ ہے کشوری۔ اور............ اور" اس نے موٹر کی طرف نگاہیں جمائے رکھیں" اور............ اور............ ارے............ یہ تو بالکل ہی چھوٹی لڑکی ہے............ ذرا تم بھی دیکھو نا............ ارے بھئی وہ............ وہ نیلی ساڑی میں۔"

جب کشوری اور سریتا دونوں موٹر کے پاس آگئے تو پچھلی سیٹ پر جو دو نوجوان بیٹھے تھے انہوں نے درمیان میں سے اپنے ہیٹ وغیرہ اٹھا لئے اور جگہ خالی کر دی۔ کشوری نے آگے بڑھ کر موٹر کے پچھلے حصے کا دروازہ کھولا اور پھرتی سے سریتا کو اندر داخل کر دیا۔ دروازہ بند کر کے کشوری نے اس نوجوان سے جو موٹر کا ہینڈل تھامے تھا کہا معاف کیجئے گا دیر ہو گئی۔ یہ باہر اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہوئی تھی............ تو............ تو............؟

نوجوان نے مڑ کر سریتا کی طرف دیکھا اور کشوری سے کہا "ٹھیک ہے............ لیکن دیکھو سرک کر موٹر کی اس کھڑکی سے اس نے اپنا سر باہر نکالا اور ہولے سے کشوری کے کان میں کہا .... "شور وور تو نہیں مچائے گی؟"

کشوری نے اس کے جواب میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "سیٹھ، آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔"

یہ سن کر اس نوجوان نے جیب میں سے دو روپے نکالے اور کشوری کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ "جاؤ عیش کرو" کشوری نے سلام کیا اور موٹر اسٹارٹ ہوئی۔

شام کے پانچ بجے تھے بمبئی کے بازاروں میں گاڑیوں، ٹراموں، بسوں اور لوگوں کی آمدورفت بہت زیادہ تھی۔ سریتا خاموشی سے دو آدمیوں کے بیچ دبکی بیٹھی رہی۔ بار بار اپنی رانوں کو جوڑ کر اوپر ہاتھ رکھ دیتی اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو جاتی۔ وہ دراصل موٹر چلانے والے نوجوان سے کہنا چاہتی تھی ''سیٹھ جلدی جلدی موٹر چلاؤ میرا تو یوں دم گھٹ جائے گا۔''

بہت دیر تک موٹر میں کسی نے ایک دوسرے سے بات نہ کی موٹر والا موٹر چلاتا رہا اور پچھلی سیٹ پر دونوں حیدرآبادی نوجوان اپنی اچکنوں میں وہ اضطراب چھپاتے رہے جو پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو بالکل اپنے پاس دیکھ کر انہیں محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی نوجوان لڑکی کو جو کچھ عرصے کے لئے ان کی اپنی تھی۔ یعنی جس سے وہ بلا خوف و خطر چھیڑ چھاڑ کر سکتے تھے۔

وہ نوجوان جو موٹر چلا رہا تھا۔ دو برس سے بمبئی میں قیام پذیر تھا اور سریتا جیسی کئی لڑکیاں دن کے اجالے اور رات کے اندھیرے میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی پہلی موٹر میں مختلف رنگ و نسل کی چھوکریاں داخل ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے کوئی خاص بے چینی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ حیدرآباد سے اس کے دو دوست آئے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا نام شہاب تھا جو بمبئی میں پوری طرح سیر و تفریح کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کفایت نے یعنی موٹر کے مالک نے ازراہِ دوست نوازی کشوری کے ذریعے سے سریتا کا انتظام کر دیا تھا۔ دوسرے دوست انور سے کفایت نے کہا تھا کہ بھئی تمہارے لئے بھی ایک رہے تو کیا حرج ہے مگر اس میں چونکہ اخلاقی قوت کم تھی اس لئے شرم کے مارے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں بھئی میرے لئے بھی ایک رہے۔

کفایت نے سریتا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کشوری بہت دیر کے بعد یہ نئی چھوکری نکال کر لایا تھا۔ لیکن اس نئے پن کے باوجود اس نے ابھی تک اس سے دلچسپی نہ لی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک وقت میں صرف ایک کام کر سکتا تھا۔ موٹر چلانے کے ساتھ ساتھ وہ سریتا کی طرف دھیان نہیں دے سکتا تھا۔

جب شہر ختم ہو گیا اور موٹر مضافات کی ایک سڑک پر چلنے لگی تو سریتا اُچھل پڑی۔ وہ دباؤ جو اب تک اس نے اپنے اُوپر ڈال رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور اُڑتی ہوئی موٹر نے ایک دم اُٹھا دیا اور سریتا کے اندر بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ وہ سرتاپا حرکت بن گئی۔ اس کی ٹانگیں تھرکنے لگیں۔ بازو ناچنے لگے، انگلیاں کپکپانے لگیں اور وہ اپنے دونوں طرف بھاگتے ہوئے درختوں کو دوڑتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب انور اور شہاب آرام محسوس کر رہے تھے۔ شہاب نے جو سریتا پر اپنا حق سمجھتا تھا۔

ہولے سے اپنا بازو اس کی کمر میں حائل کرنا چاہا ایک دم سریتا کے گدگدی اٹھی تڑپ کر وہ انور پر جا گری اور پیلی موٹر کی کھڑکیوں میں سے دور تک سریتا کی ہنسی بہتی گئی۔ شہاب نے جب ایک بار پھر اس کی کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سریتا دوہری ہوگئی اور ہنستے ہنستے اس کا بڑا حال ہوگیا۔ انور ایک کونے میں دبکا رہا اور منہ میں تھوک پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

شہاب کے دل و دماغ میں شوخ رنگ بھر گئے۔ اس نے کفایت سے کہا ''واللہ بڑی کراری لونڈیا ہے'' یہ کہہ کر اس نے زور سے سریتا کی ران میں چٹکی بھری۔ سریتا نے اس کے جواب میں انور کا ہولے سے کان مروڑ دیا اس لئے، کہ وہ اس کے بالکل پاس تھا۔ موٹر میں قہقہے ابلنے لگے۔

کفایت بار بار مڑ کر دیکھتا تھا۔ حالانکہ اسے اپنے سامنے چھوٹے سے آئینے میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ قہقہوں کے زور کا ساتھ دینے کی خاطر اس نے موٹر کی رفتار بھی تیز کردی۔

سریتا کا جی چاہا کہ باہر نکل کر موٹر کے منہ پر بیٹھ جائے۔ جہاں لوہے کی اُڑتی ہوی پری لگی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ شہاب نے اسے چھیڑا تو سنبھلنے کی خاطر اس نے کفایت کے گلے میں اپنی باہیں حمائل کردیں۔ کفایت نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ چوم لئے۔ ایک سنسنی سی سریتا کے جسم میں دوڑ گئی اور وہ پھاند کر اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور اس کی ٹائی سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے کفایت سے پوچھا۔

''میرا نام!'' کفایت نے پوچھا ''میرا نام کفایت ہے'' یہ کہہ کر اس نے دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

سریتا نے اس کے نام کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نوٹ اپنی چولی میں اُڑس کر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا ''تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تمہاری یہ ٹائی بہت اچھی ہے۔''

اس وقت سریتا کو ہر شئے اچھی نظر آرہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو بُرے بھی ہیں اچھے ہو جائیں اور............ اور............ پھر ایسا ہو، ایسا ہو............ کہ موٹر تیز دوڑتی رہے اور ہر شئے ہوائی بگولہ بن جائے۔

ایک دم اس کا جی چاہا کہ گائے۔ چنانچہ اس نے کفایت کی ٹائی سے کھیلنا بند کر کے گانا شروع کر دیا۔

تمہیں نے مجھ کو پریم سکھایا سوئے ہوئے ہردے کو جگایا

کچھ دیر یہ فلمی گیت گانے کے بعد سریتا ایک دم پیچھے مڑی اور انور کو خاموش دیکھ کر کہنے لگی ''تم کیوں چپ چاپ بیٹھے ہو۔ کوئی بات کرو۔ کوئی گیت گاؤ'' تو یہ کہہ کر وہ اچک کر پچھلی سیٹ

پر چلی گئی اور شہاب کے بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ ''آؤ ہم دونوں گائیں۔ تمہیں یاد ہے وہ گانا جو دیویکا رانی نے گایا تھا۔

...... من بَن کی چڑیا بن کے بَن بن بولوں رے...... دیویکا رانی کتنی اچھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی تھوڑی کے نیچے رکھ لئے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔'' اشوک کمار اور دیویکا رانی پاس پاس کھڑے تھے...... دیویکا رانی کہتی تھی...... میں بن کی چڑیا بن کے بن بن بولوں رے...... اور اشوک کمار کہتا تھا...... تم کہو نا۔''

سریتا نے گانا شروع کر دیا...... میں بن کی چڑیا بن کے بَن بَن بولوں رے۔''
شہاب نے بھدی آواز بلند کی۔ ''میں بَن کا پنچھی بن کے بَن بن بولوں رے۔''

اور پھر باقاعدہ ڈوئٹ شروع ہو گیا۔ کفایت نے موٹر کا ہارن بجا کر تال کا ساتھ دیا۔ سریتا نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ سریتا کا باریک سر، شہاب کی پھٹی ہوئی آواز، ہارن کی پوں پوں، ہوا کی سائیں سائیں اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ، یہ سب مل جل کر ایک آرکسٹرا بن گئے۔

سریتا خوش تھی، شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا ان سب کو خوش دیکھ کر انور کو بھی خوش ہونا پڑا۔ وہ دل میں بہت شرمندہ ہوا کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے۔ اس کے بازوؤں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے سوئے ہوئے جذبات نے انگڑائیاں لیں اور وہ سریتا، شہاب اور کفایت کی شور افشاں خوشی میں شریک ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

گاتے گاتے سریتا نے انور کے سر پر سے اس کا ہیٹ اُتار کر اپنے سر پر پہنلیا اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کے سر پر کیسا لگتا ہے۔ اچک کر اگلی سیٹ پر چلی گئی اور مجھے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی...... انور سوچنے لگا کہ موٹر میں وہ شروع ہی سے ہیٹ پہنے بیٹھا تھا؟

سریتا نے زور سے کفایت کی موٹی ران پر طمانچہ مارا۔ اگر میں تمہاری پتلون پہن لوں اور قمیض پہن کر ایسی ٹائی لگا لوں تو کیا پورا صاحب نہ بن جاؤں؟''

یہ سن کر شہاب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ چنانچہ اس نے انور کے بازوؤں کو جھنجھوڑ دیا۔ ''واللہ تم نرے چغد ہو۔'' اور انور نے تھوڑی دیر کے لئے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت بڑا چغد ہے۔

کفایت نے سریتا سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام'' سریتا نے ہیٹ کے فیتے کو اپنی تھوڑی کے نیچے جماتے ہوئے کہا میرا نام سریتا ہے''

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا ''سریتا تم عورت نہیں پھلجھڑی ہو۔''

انور نے کچھ کہنا چاہا مگر سریتا نے اونچے سروں میں گانا شروع کر دیا ہے۔

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں
تج کے سب سن سا آر

کفایت اور شہاب کے دل میں بیک وقت یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ موٹر یونہی ساری عمر چلتی رہے۔ انور پھر سوچ رہا تھا کہ وہ چغد نہیں ہے تو کیا ہے۔

پریم نگر میں بناؤں گی گھر میں
تج کے سب سن سا آر

سنسار کے ٹکڑے دیر تک اُڑتے رہے.......... سریتا کے بال جو اس کی چوٹی کی گرفت سے آزاد تھے یوں لہرا رہے تھے جیسے گاڑھا سا دھواں ہوا کے دباؤ سے بکھر رہا ہے۔ وہ خوش تھی۔

شہاب خوش تھا، کفایت خوش تھا اور اب انور بھی خوش ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ گیت ختم ہو گیا اور سب کو تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ زور سے بارش ہو رہی تھی۔ ایکا ایکی تھم گئی۔

کفایت نے سریتا سے کہا ''کوئی اور گیت گاؤ۔''

شہاب پچھلی سیٹ سے بولا ہاں ہاں ایک اور رہے۔ یہ سنیما والے بھی کیا یاد کریں گے۔''

سریتا نے گانا شروع کر دیا۔

مورے آنگنا میں آئے آلی
میں چال چلوں متوالی

موٹر بھی متوالی چال چلنے لگی.......... آخر کار سڑک کے سارے پیچ ختم ہو گئے اور سمندر کا کنارہ آ گیا.......... دن ڈھل رہا تھا اور سمندر سے آنے والی ہوا خنکی اختیار کر رہی تھی۔

موٹر رکی۔ سریتا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک بے مقصد دوڑتی چلی گئی۔ کفایت اور شہاب بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ کھلی فضا میں بے پایاں سمندر کے پاس تاڑ کے اُونچے اُونچے پیڑوں تلے گیلی گیلی ریت پر سریتا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بیک وقت فضا میں گھل جائے۔ سمندر میں پھیل جائے اتنی اونچی ہو جائے کہ تاڑ کے درختوں کو اوپر سے دیکھے۔ ساحل کی ریت کی ساری نمی پیروں کے ذریعے سے اپنے اندر جذب کر لے اور پھر.......... اور پھر وہی موٹر ہو اور وہی اُڑانیں وہی تیز تیز جھونکے اور وہی مسلسل پوں پوں۔ وہ بہت خوش تھی جب تینوں حیدرآبادی نوجوان ساحل کی گیلی گیلی ریت پر بیٹھ کر بیئر پینے

لگے تو کفایت کے ہاتھ سے سریتا نے بوتل چھین لی۔ ''ٹھہرو میں ڈالتی ہوں۔''

سریتا نے اس طریقے سے گلاس میں بوتل ڈالی کہ جھاگ ہی جھاگ پیدا ہو گئے۔ سریتا یہ تماشا دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سانولے سانولے جھاگوں میں اس نے اپنی انگلی گھولی اور منہ میں ڈال لی۔ جب کڑوی لگی تو بہت بُرا منہ بنایا۔ کفایت اور شہاب بے اختیار ہنس پڑے۔ جب دونوں کی ہنسی بند نہ ہوئی تو کفایت نے مُڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ انور بھی ہنس رہا تھا۔

بیئر کی چھ بوتلیں کچھ تو جھاگ بن کر ساحل کی ریت میں جذب ہو گئیں اور کچھ کفایت، شہاب اور انور کے پیٹ میں چلی گئیں۔ سریتا گاتی رہی.........انور نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور خیال کیا کہ سریتا بیئر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے گال سمندر کی نم آلود ہوا کے لمس سے گیلے ہو رہے تھے.........وہ بے حد مسرور تھی۔ اب انور بھی خوش تھا۔ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ سمندر کا سب پانی بیئر بن جائے اور وہ اس میں غوطے لگائے۔ سریتا بھی ڈبکیاں لگائے۔

دو خالی بوتلیں لے کر سریتا نے ایک دوسرے سے ٹکرا دیں۔ جھنکار پیدا ہوئی اور سریتا نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ کفایت، شہاب اور انور بھی ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے سریتا نے کفایت سے کہا ''آؤ موٹر چلائیں۔''

سب اٹھ کھڑے ہوئے.........خالی بوتلیں گیلی گیلی ریت پر اوندھی پڑی رہیں اور وہ سب بھاگ کر موٹر میں بیٹھ گئے۔ پھر وہی ہوا کے تیز تیز جھونکے آنے لگے.........وہی مسلسل پوں پوں شروع ہوئی اور سریتا کے بال پھر دھوئیں کی طرح بکھرنے لگے۔ گیتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔

موٹر ہوا میں آرے کی طرح چلتی رہی.........سریتا گاتی رہی.........پچھلی سیٹ پر شہاب اور انور کے درمیان سریتا بیٹھی تھی۔ انور اُونگھ رہا تھا سریتا نے شرارت سے شہاب کے بالوں میں کنگھی کرنا شروع کر دی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سو گیا۔ سریتا نے جب انور کی طرف رخ کیا تو اسے ویسا ہی سویا ہوا پایا۔ ان دونوں کے بیچ میں سے اٹھ کر وہ اگلی سیٹ پر کفایت کے پاس بیٹھ گئی اور آواز دبا کر ہولے سے کہنے لگی۔ ''آپ کے دونوں دوستوں کو سلا آئی ہوں.........اب آپ بھی سو جایئے۔''

کفایت مسکرایا۔ ''پھر موٹر کون چلائے گا۔''

سریتا بھی مسکرائی ''چلتی رہے گی۔''

دیر تک کفایت اور سریتا آپس میں باتیں کرتے رہے اتنے میں وہ بازار آ گیا جہاں

کشوری نے سریتا کو موٹر کے اندر داخل کیا تھا…… جب وہ دیوار آئی جس پر ''یہاں پیشاب کرنا منع ہے'' کے کئی بورڈ لگے تھے تو سریتا نے کفایت سے کہا۔ ''بس یہاں روک لو۔''

موٹر رکی بیشتر اس کے کہ کفایت کچھ سوچنے یا کہنے پائے۔ سریتا موٹر سے باہر تھی۔ اس نے اشارے سے سلام کیا اور چل دی…… کفایت ہینڈل پر ہاتھ رکھے غالباً سارے واقعہ کو تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سریتا کے قدم رکے۔ مڑی اور چولی میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کفایت کے پاس سیٹ پر رکھ دیا۔

کفایت نے حیرت سے نوٹ کی طرف دیکھا اور پوچھا ''سریتا یہ کیا؟''

''یہ…… یہ روپے میں کس بات کے لوں؟'' کہہ کر سریتا پھرتی سے دوڑ گئی اور کفایت سیٹ کے گدے پر پڑے نوٹ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

اس نے مڑ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا شہاب اور انور بھی نوٹ کی طرح سو رہے تھے۔

☆☆

ممّی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ میں کیسے آئی، کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پونہ کے ہر ذرّے سے وابستہ تھی۔ ہوسکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو، مگر پونہ میرے لئے وہی پونہ ہے، اور اس کے وہی ذرّے، اس کے تمام ذرّے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں —— اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونہ ہی میں ہوئی.......... میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں، آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھے گا کہ میں عنقریب کنچن جنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کرکے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونہ گیا تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں.......... ٹھہریے میں حساب لگا لوں.......... آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو محض

اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا، اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لئے پونہ ہوآؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا، جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے تھے۔ سست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لئے آیا تھا، اس لئے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گردے اٹے ہوئے بازار افتاں و خیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں، وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہوگا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا —— دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہوگا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا "اوئے منٹو کے گھوڑے!"

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی جھریاں ہوگئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوالیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہوکر انگریزی میں کہا: "ممی! جسٹ اے منٹ" تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا "تم —— تم یہاں کیسے آئے؟" پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پرتکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا "بھابی جان —— آپ نے

کمال کر دیا ——— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

چڈے نے اونچے سرور میں کہا: "ایک کام سے جا رہا ہوں ——— تم ایسا کرو، سیدھے" .... وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا: "دیکھو، صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ ——— کرایہ ورایہ مت لینا ان سے۔" ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نبٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا: "تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہو گا ——— باقی تم دیکھ لینا۔"

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا: "چلئے صاحب.........." میں نے پوچھا: "کہاں؟" اس نے جواب دیا: "چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے۔"

"اوہ" میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھیے تو وہ پونہ ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدّر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے، اس لئے دن رات اُڑے گی ——— میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا: "چلو!"

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہو گا؛ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا بنگلہ بنایا تھا، تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا ہو سکتا ہے جو فلموں کا ہیرو ہو، اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گنجے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے سوچا تھا کہ چڈہ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔

وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جان درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا، جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی، دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا: ''رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے، معلوم نہیں کدھر گئے''۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا: ''کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں۔''

تیل لینے جانا بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا: ''نہیں صاحب .... میں .... تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔''

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا جیسے وہی اس کی جگہ تھی، اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا: ''ویٹ از ویٹ ——— تو تم آ گئے اولڈ بوائے ——— چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی .... آج شام کو............'' میری بیوی

پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگا: "بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا"؟ پھر اور زور سے ہنسا "مولویوں کی ایسی تیسی! اٹھو منٹو، بھابی جان یہاں بیٹھتی ہیں، ہم ابھی آ جائیں گے!"

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی: چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افراتفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کئے اور ہم پون گھنٹہ میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی، حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سالگی اختیار کر گئی ہر شئے گرد آلود تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا، جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا: "چین کے شہزادے...... دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ—— میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی، اور نصف درجن گلاس"۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آ جاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا—— اس وقت چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑکھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا: "ویٹ از ویٹ—— تو آفٹر آل تم ادھر آ ہی نکلے——" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا۔ "یار، بھابی کا کیا ہو...... وہ تو گھبرا جائے گی"۔

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کو لڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں"۔

رم فوراً ہی آ گئی، اور گلاس بھی۔ چڈے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے چڈے نے ان کی کوئی پروانہ کی۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا:

'' تمہارے پونہ آنے کی خوشی میں۔''

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا: '' میں شور کرتا ہوں، ان کی نیند کھل جائے گی —— پھر ایسا کریں گے .... ٹھہرو —— پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی: '' جمیکا کے شہزادے!''

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آ گیا۔ چڈے نے اس سے کہا: '' دیکھو، ممی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے —— ایک دم!''

نوکر چلا گیا۔ چڈے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا: '' میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔''

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آ گئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرّت کا اظہار کیا: '' ممی از اے جیول .... '' پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا۔ '' آؤ!''

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا: '' حاضر ہے بیگم صاحب!''

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا، اس لئے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی۔ اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا: '' آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!''

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈے نے جھک کر بڑے ایماندار طور پر کہا: —— '' جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے، لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔''

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھل کھلا کے ہنسا: '' ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں .... جن پر ہر حرام شئے حلال ہے —— چلئے اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں!''

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہئے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا، اس لئے کہ وہ

بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا۔ مگر چڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی ان ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی۔ ''کبابستان کے شہزادے ——— ایک عدد تانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔''

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا تھا تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آ ہی جایا کرتے ہیں جو ہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کنفیوشیسانہ نصیحت کو پلے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا: ''خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: ''چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔''

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: ''یہ تو ہو گیا ——— اب کیا پروگرام ہے۔'' پھر کھل کھلا کر ہنسا: ''ممی ——— گریٹ ممی!''

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا یہ ممی کس توتخ آمون کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا، اس لئے کہ اس میں رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کاٹیج میں کافی آدمی رہتے تھے۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ

سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر، کوئی اس کا نائب در نائب۔ ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا۔ اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں، یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچرز ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے ساذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کاٹیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لئے موٹر گراج بھی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید، محض یکسانیت توڑنے کے لئے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کاٹیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی، اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کاٹیج کا معزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا یہ دونوں بھی ایکٹر تھے مگر ہیرو نہیں تھے ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا —— چڈہ کہا کرتا تھا: ''سعیدہ کاٹیج اسی خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کاٹیج ہی تھا۔'' خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لئے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدرآباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لئے تھے، وہ بھی چڈے کے لئے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کاٹیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی با کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کاٹیج کے

بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا، کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اس کے روتے بچّے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی کبیدگی پر وہ اپنے حالات کی نا مساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کالج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آ رہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا: ''چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجئے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔''

غریب نواز کے حیدر آبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا:

یہ مسٹر ون ٹو ہیں......... لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پئے ہیں۔ شام کو اسکاچ آ جائے تو......... لیکن آپ جائیے۔''

غریب نواز چلا گیا ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی: ''قزامستان کے شہزادے'' جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا: ''زیادہ پی گیا ہے کم بخت!''

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا: ''یار بھابی کو تم خوامخواہ یہاں لائے — خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔'' پھر اس نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوگی وہاں۔''

میں نے کہا: ''ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی'' اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ پسے ہوئے گڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے، اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصہ نظر آتا تھا۔ ادھر سے کسی نے باآواز بلند چڈہ کا نام پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ

میوزک ڈائریکٹر ون کترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے، حبشی ہے آریہ ہے یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کسی خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آجاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان سروں کے لئے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلاّیا: ''منٹو — منٹو سیٹھ!''

چڈے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا ''سیٹھ کی ایسی تیسی .... چل، اندر آ''۔ وہ فوراً اندر آ گیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی۔ ''میں سالا ادھر ممیّ کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمہارا فرینڈ آئے لا .... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے .... سالا مالوم نہ تھا سالا منٹو ہے۔''

چڈے نے ون کترے کے کدوایسے سر پر ایک دھول جمائی۔ ''اب چپ کر سالے کے .... تو رم لے آیا .... بس ٹھیک ہے۔ ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لئے پیگ تیار کیا۔ ''منٹو .... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے .... میں ایک دم کڑکا .... سوچا کیا کروں۔''

چڈے نے ایک اور دھپا اس کے سر پر جمایا: ''بیٹھ بے جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔''

''سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا — تیرے باپ نے دیا مجھ کو۔'' ون کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈے نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اس سے پوچھا: ''تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی؟ —— بولی تھی؟ — موذیل کب آئے گی؟ ارے ہاں .... وہ پلیٹینم بلونڈ!''

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڈے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا۔ ''منٹو — خدا کی قسم کیا چیز ہے — سنا کرتے تھے کہ ایک شئے پلیٹینم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا — بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار — گریٹ — خدا کی قسم منٹو بہت گریٹ .... ممیّ زندہ باد!'' پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔ ''کن کترے کے بچے — نعرہ کیوں نہیں لگاتا — ممیّ زندہ باد!''

چڈے اور ون کترے دونوں نے مل کر ''ممیّ زندہ باد'' کے کئی نعرے لگائے اس کے بعد ون کترے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش کر دیا۔

''چھوڑ و یار—میں جذباتی ہو گیا ہوں—اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے— مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے—'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''منٹو—بڑی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں—چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا—معلوم نہیں پلیٹینم کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی— کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے— فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے۔ ون کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔'' اور اس میں تھوڑی سی تھری ایکس رم مکس کر دی۔

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی''— بکواس نہ کر۔'' پھر اس نے بڑی رحم انگریز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''یار—میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں—ہاں—وہ رنگ—خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے—وہ تم نے دیکھا ہے—وہ جو مچھلیوں کے پیٹ میں ہوتا ہے—نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے—پومفریٹ مچھلی—اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟—نہیں نہیں—سانپوں کے—وہ ننھے ننھے کھپرے—ہاں کھپرے—بس ان کا رنگ

کھپرے—یہ لفظ مجھے ایک ہند ستوڑے نے بتایا تھا—اتنی خوبصورت چیز اور اتنا واہیات نام......پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے......وہی ......بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے......ننھی ننھی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں......'' وہ ایک دم اٹھا۔ ''سنپولیوں کی ایسی تیسی، میں جذباتی ہو گیا ہوں۔''

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا: ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

چڈے نے جواب دیا: ''سنئے مغل......لیکن تو کیا سمجھے گا بالاجی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد......''

ون کترے نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ سالا چڈہ سمجھتا ہے میں، انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں......سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا......اس نے......''

چڈے نے چڑ کر کہا: ''اس نے تجھے تان سین بنا دیا......تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سُر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں......بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے کے لئے تو میاں کی ٹوڑی میں رویا کرتا تھا۔ اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں

...... اور تو نے پہلی بات پٹ وپکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ ...... جگت استاد تھا، بجو باورے کے بھی کان کاٹتا تھا۔ ...... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے۔ اسی لئے تیرا نام کن کترے ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: ''منٹو ...... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے ...... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا۔ اور اس نے اس میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی۔ اے کی ڈگری پھاڑ کر پھینک دوں۔''

ون کترے نے اس بوچھار کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اس کو وہیں دبا دیا: ''چپ رہ ...... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی مینٹل ہو گیا ہوں ...... ہاں، وہ رنگ ...... پومفریٹ مچھلی کے ...... نہیں نہیں — سانپ کے ننھے ننھے کھپرے ...... بس انہی کا رنگ ...... ممی نے خدا معلوم اپنی بین پر کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا!''

ون کترے سوچنے لگا: ''بین منگاؤ، میں بجاتا ہوں۔''

چڈہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا: ''بیٹھ بے میٹریکولیٹ کے چاکولیٹ ......'' اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا: ''منٹو اگر یہ پلیٹنیم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا ......'' اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی: ''منٹو ملکی ایک دم چانگلی ہے ......''

میں نہ کہا: ''دیکھ لیں گے۔''

''آج ہی ...... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتاجی نے تمہاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی ...... آج کی رات ...... آج کی رات ......'' چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

''آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ''

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آ گئے۔

دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں، اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پئے

تھے۔ نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بری طرح فریفتہ تھے جو ممّی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونہ میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدر آباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتّا تھا، اپنا قبول صورت ہونا، ون کترے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اس کی پیٹی سن کر وہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھئے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹینم بلونڈ فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا: ''جہنم میں جائے یہ لونڈیا— چلو یار........ بھابی وہاں کباب ہو رہی ہوگی— لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں........ خیر— تم مجھے سنبھال لینا۔'' اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی: ''ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے!''

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا: ''دو عدد تانگے لاؤ........ جو مصری رتھ معلوم ہوں۔''

تانگے آگئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے— میرا پرانا فلموں کا ساتھی ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیظ و غضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا، بڑی پرلطف باتیں کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا: ''کوئی گانا فلما رہے ہیں آپ؟''

ہریش نے جواب دیا: ''جی نہیں........ وہ کل کا پروگرام ہے........ میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔''

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی، اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا: "ہاں کل ٹھیک رہے گا— آج تو انہیں سفر کی تھکن بھی ہے۔"

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پرلطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا: "چلو یار— تم چلو میرے ساتھ!" اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا "ان کو چھوڑو........ سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔"

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا: "ان سے اجازت لے لو۔"

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا: "میں نے بمبئی سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکومنٹ کیس ساتھ لے چلیے پر انہوں نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں— اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔"

ہریش نے کہا: "زبانی سنا دے گا۔" پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا: ہاں ایسا ہو سکتا ہے"

چڈے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا: "تو بھئی ہم چلتے ہیں۔" اور وہ تینوں اٹھ کر نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے— پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا: "راجہ ہریش چندر زندہ باد........"

ہریش کے سوا ہم سب ممی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک ٹکلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی۔ شکل وصورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی مگر بہت صاف ستھری جس سے ممی کے سلیقے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی سجی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہو گا مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے، لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گردوپیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں— ان کی عمر جو تھی وہ وہیں کی وہیں رہی ہے........ لیکن جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گردوپیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ ومتین

طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے اس سے میرا تعارف کرایا جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممی کے متعلق مجھ سے یہ کہا: ''یہ ممی ہیں.......... دی گریٹ ممی.........''

ممی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔ اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا: ''تم نے چائے منگوائی تھی۔ حسب معمول نہایت افراتفری میں — معلوم نہیں انہیں پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: مسز منٹو میں بہت شرمندہ ہوں......... اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے — جو میرا ناقابل اصلاح لڑکا ہے۔''

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا:

''رات کا کھانا تیار ہے.......... یہ میں نے اس لئے کہا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے.........''

چڈے نے ممی کو گلے سے لگا لیا: ''یو آر اے جیول ممی...... یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔''

ممی نے چونک کر پوچھا: ''کیا؟......... نہیں ہرگز نہیں۔''

چڈے نے اسے بتایا ''مسز منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔''

ممی چلائی: خدا تمہیں غارت کرے — یہ تم نے کیا کیا —''

چڈہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ''آج پارٹی جو دی جانے والی تھی۔''

''وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔'' ممی نے اپنا سگریٹ سلگایا۔

چڈے کا دل ڈوب گیا: ''خدا اب تمہیں غارت کرے......... اور یہ سب پلین ہم نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔'' وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرّے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''لو سارے خواب ملیا میٹ ہو گئے......... پلیٹی نم بلونڈ......... اوندھے سانپ کے تھے تھے کھپروں جیسے رنگ والے بال......'' ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا: ''کینسل کی تھی — اپنے دل میں کینسل کی تھی نا — لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔'' اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور بآواز بلند پکارا: ''ہرّے!''

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی! چنانچہ اس نے بڑی شفقت سے اس کے گال تھپ

تھپائے اور کہا: ''تم فکر نہ کرو............ میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔''

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔۔ چڈے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا: ''جنرل ون کترے — جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری بوتلیں لے آؤ۔''

ون کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کاٹیج بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے چڈے کا نوکر تھا۔ چڈے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا۔ ''آؤ آؤ — میر کوہ قاف کے شہزادے......... وہ — وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آ رہی ہیں ----- تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔''

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈے کی یہ ''صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے'' والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انہوں نے بہت محسوس کیا تھا چڈہ حسب عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا ڈرائنگ روم میں، غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈہ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا، اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا، اس لئے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے ....

شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ .... اس کا تصوّر ایک چھوٹی سی گڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا — ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے .... اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس میں کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شئے، ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھرّیوں کو توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور ون کترے کے لیے موجود ہے .... اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا: ''یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے۔''

”اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے.........تمہارے اور میرے جیسے اُلو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں، جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور.........اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے.........ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں اُلو کے پٹھے ہیں.........میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں......... بیساکھی کا میلہ تھا.........تمہارے امرتسر میں.........رام باغ کے اس بازار میں جہاں ٹکھیائیاں رہتی ہیں.........جاٹ گزر رہے تھے.........ایک صحت مند جوان نے.........خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی پتی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا جس کی تیل میں چپڑی ہوئی ببریاں، اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹہوکا دے کر کہا.........اوئے لہنا سیاں.........وخ اوئے، اپر وخ......اسی تے پنڈ وچ مجھاں ای.........“ آخری لفظ وہ خدا معلوم کیا گول کر گیا، حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھل کھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا: ”اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی.........اور اس کے گاؤں کی حسین و جمیل مٹیاریں، بے ڈھول بھینسیں.........ہم سب چغد ہیں.........درمیانے درجے کے.........اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اوّل درجے کی نہیں.........تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی......... لیکن.........لیکن فی لس.........خاص الخاص درجے کی چیز ہے.........وہ سانپ کے کھپروں.........“

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا: ”کھپرے.........کھپرے.........تمہارا مستک پھر گیا ہے۔“

چڈے نے ماتھے پر سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور ون کترے سے کہا: ”لے اب سنا.........تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا.........میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے!“

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا: ”بائی گاڈ.........وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا.........میں ففٹین ایئرز کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔“

چڈہ زور سے ہنسا: ”تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے.........بھگوان اسے سورگ میں کسیریل کی پٹی دے کہ وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لئے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈ تا رہے۔“

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا: ''منٹو.......... میں جھوٹ نہیں کہتا.......... میری وائف ایک دم بیوٹی فل ہے.......... ہماری فیملی میں..........''

تمہاری فیملی کی ایسی تیسی.......... فی لس کی بات کرو.......... اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہوسکتا: '' چڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے '' گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو.......... سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی — میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا.......... کیوں، ویلز کے شہزادے؟''

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کر باتیں تو کرتے رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرز گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار نے غریب نواز کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد و قامت اور خطوط والوان کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھلیما.......... اور وہ ہیجڑا نما لڑکا.......... اس کو چڈہ سسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹینم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیب کمار کا رد عمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتح مندانہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی بری کہ ون کترے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروانہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تا تھئی تھئی کی دن، تو تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا، ادھر چڈہ باقی لڑکیوں کی

جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے لرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے ——— ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا، اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے اپنے پلیٹینی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی چڈے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لئے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا: ”بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔“

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا اور اس نے اسی خوشی میں بیس پچیس اور لرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے ——— میں نے سوچا عریانی سے تنگ آ کر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردِعمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے……

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش، جوان لڑکیوں میں گھلی ملی، چڈے کے ننگے ننگے لرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی ——— اس کے چہرے پر وہی واہیات میک اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھرُیاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھی…… میں نے سوچا آخر لوگ کیوں فرار کو بُرا سمجھتے ہیں…… وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اس کا ظاہر گو بدنما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا…… اس پر کوئی بناؤ سنگھار کوئی غازہ، کوئی اُبٹنا نہیں تھا۔

پولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرا لی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے ——— اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا؛ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی، وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر

معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کئے جا رہا تھا۔ تھیلما ون کترے سے تانڈیو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پیے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آدمی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ اور چڈہ، فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو پگھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی لس کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی.......... اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کئے ستاتی ہے مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا.......... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے۔

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے—اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے.......... کیوں آدمی چند لمحات کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لئے ممتا تھی—میں نے سوچا، شاید اس لئے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو.......... اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی.......... اس نے شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تگڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے، نہیں سب کے

سامنے۔ مگر ممی اس قت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔ فی لس نشے میں تھی۔ ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کئے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون کترے تھیلما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ ہی میں اس نے اس کی شادی بنا دی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے.......... اور غریب نواز، ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں — تپائی کے اردگرد فی لس اور اس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا — غریب نواز اور ڈولی اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں۔.......... ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا پھر تھیلما کی طرف جو اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصلحت کی مہین مہین کوشش کی مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آجائے مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا: ”تم دیوانی ہو گئی ہو.......... بوڑھی دلالہ.......... فی لس میری ہے — پوچھ لو اس سے:“

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا: ”چڈہ مائی سن.......... تم کیوں نہیں سمجھتے.......... شی از ینگ — شی از ویری ینگ!

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے

نی لس کی طرف دیکھا۔ اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ بمشکل پندرہ برس کی .... اس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا —— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی: ''چڈہ ..... چھوڑ دو .... فورگارڈز سیک .... چھوڑ دو اسے۔''

جب چڈے نے نی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا: ''گٹ آؤٹ .... گٹ آؤٹ!''

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ نی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیض اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی جو گیراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا: ''وہ لاجواب عورت ہے —— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت .... دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔''

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی —— معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف جس سے وہ مخاطب تھا —— میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا —— ہرلیش گھر میں نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونہ میں کافی تفریح ہو گئی تھی، اس لئے میں نے ہرلیش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے ——

ہم چل دیئے .... راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من

وئن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہوگی۔ یا وہ اسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی، جب ہی اس نے چڈے سے لڑائی کی...... میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا: ''میں اس روز حیوان بن گیا تھا —— لعنت ہو مجھ پر!''

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ گیراج سے باہر نکل کر شیریں کے خوردسال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آ گیا۔ کچھوے کی چال چلتا، اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی...... رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونہ میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اُڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا، اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے...... بخار رہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا —— سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا اس کا رخ گیراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گیراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڈے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو گیا...... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ تانگے والے نے بیہوش چڈے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہوگا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہئے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا: ''کیا ہوا

میرے بیٹے کو؟‘‘

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا: ’’تم کیسے لوگ ہو —— مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔‘‘ پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کی پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہوگئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گیراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے —— میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممی آئی۔ غریب نواز، ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا: ’’ممی یو آر گریٹ!‘‘

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا: ’’میرے بیٹے...... میرے غریب بیٹے!‘‘

چڈے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا: ’’نہیں —— تمہارا بیٹا اوّل درجے کا اسکاؤنڈرل ہے...... جاؤ اپنے مرحوم شوہر کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!‘‘

ممی نے چڈے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا: ''فضول بکواس نہ کرو!'' پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اُٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا: ''لڑکو ـــــ چڈہ بیمار ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ـــــ سمجھے؟''

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈہ بہت ضدی تھا، مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ـــــ ممی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے۔ یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیوٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی، اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممی نہ مانی۔ اس نے چڈے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ دن بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا جس میں صرف یہ لکھا تھا ''عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔''

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا: ''ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔''

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے جن کا جواب نہ آیا بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونہ پہنچا، اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا مگر اس کی غوغا پسند طبیعت

اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لئے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی اس لئے اس نے وہیں اپنا ڈیرا جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا ”میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ —— ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے، بہتر ہے۔“

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا، اس لئے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفہ الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیضیں اور شلواریں لٹک رہی تھیں جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونہ میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا ہٹا کٹا مسٹنڈا تھا۔ چڈے نے اس کو حوصلہ دیا تھا کچھ پروا نہ کرو اس سالے کی .... جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے —— بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔“

ہر لیش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب ولہجہ میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما، تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تاتھئی، اور دھانی ناکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا اور وہ اسے سیکھنے کی پرخلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا۔ اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا —— چڈے کے ننگے لمرک سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے...... ایک صرف وہ نہیں تھی...... وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لئے صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈے کی نظریں ممی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا "چڈہ یو آر اے ڈیمڈ بروٹ!"

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرا دیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے "ڈونٹ ٹوک روٹ۔"

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا، اور اپنا میٹریکولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی وہی ممی تھی — پولی کی ممی ڈولی کی ممی، رنجیت کمار کی ممی —— سوڈے کی بوتلوں گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے ساز و سامان کے انتظام میں وہ اسی پرشفقت انہماک سے حصہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ و شنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کہ پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر سمٹ کر، وہ دوڑ گئے تھے...... چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا...... ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھی۔

وان کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات سنا دی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کٹی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دیدے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔

اس نے کٹی سے کہا تھا ”تم اس وقت اسے دے دو —— بعد میں لیتی رہنا“۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچے کی موت کو اتنی برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔

رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی ”ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو“۔ چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ ”مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے —— فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں“۔ یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لئے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونہ ٹیلی فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتہ کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین

ہے، خون میں لت پت چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش وحواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا: ''بھاپا جی——مر گیا؟''

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا: ''مجھے چھوڑ دیجیے میں بھاگوں گا نہیں۔

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا۔ بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے، سچ سچ بتا دو ——اور اس نے تمام واقعات من وعن بیان کر دیے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا، اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں، جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان

کئے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا: ''اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے —اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے۔''

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرز شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لئے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انہوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا ''اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔''

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر خلاف معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کٹی کی فوری ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیئے۔ اور رنجیت کمار سے اس نے کہا ''تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو.......... ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی.......... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!''

میں نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لئے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا——شیریں نے سفر کے لئے اس کا کھانا پکا دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل و صورت ہزارہا قافلوں کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لئے کہیں سے دو پیدا کئے تھے، ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لئے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا: ''تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے

آیا ہے ــــــ بڑا کمال کیا ہے تو نے .... اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا ہرگز کوئی بات نہ کرنا"۔

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا: "سالے میں اب کوئی پنے لا ہوں...... وہ تو دارو بولا کرتی ہے............ ویسے بائی گاڈ............ میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے............"

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہوگئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لیے لکھ رہا تھا۔

پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے، اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا، لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کے ٹریجڈی............ معلوم نہیں کیا وجہ تھی............ لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ ون کترے بھی غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں، اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: "اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے"۔

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی —— ’’ہاں .... دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے‘‘۔

’’کہاں ہے یہ ہزار؟‘‘ یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

’’میری جیب میں!‘‘

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا ’’آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا —— ایک پارٹی ہے۔‘‘

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی، بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا —— میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا، کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گیراج کے باہر الگنی پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ، رنجیت کمار کٹی اور ایلما کے ساتھ اور ورن کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کودر ہا تھا —— سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیسی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی —— ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا: ’’کس می ڈیئر!‘‘

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکارا ’’بند کرو —— اب شراب کا دور چلے گا‘‘۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی: ’’اسکاٹ لینڈ کے شہزادے —— وسکی کی نئی بوتل لاؤ‘‘۔ اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔

نشے میں دُھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہوگئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا: ''ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی — جانے دو یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں''۔

محفل ایک دم سونی ہوگئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کردیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربط سی تقریر شروع کی: ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... آپ سب جہنم میں جائیں...... منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی —— وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے...... مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے...... کنویں میں اترنے والے...... کنویں میں اترنے والے...... اس نے ادھر ادھر دیکھا ''افسوس کہ یہاں کوئی ہندوستوڑا نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے۔ اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی ہو تو کہے گا پرسوں آپ سے ملا تھا —— لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں...... ہاں...... وہ کنویں میں اترنے والے...... میں نے کیا کہا تھا، کہ سب بکواس ہے...... پنجابی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں...... وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں...... اس لئے میں کہتا ہوں......''

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا: ''یہ سب سازش ہے —— اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہر ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا...... تم سب مردہ باد...... لیکن پہلے میں...... میں......'' وہ جذباتی ہوگیا۔ ''میں...... جس نے اس رات اس...... سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کردیا...... میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا...... لیکن نہیں...... اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم! ایک ہی بوسے میں اس پلیٹینم بلونڈ کے کنوارپنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا...... لیکن یہ ایک...... یہ ایک نامناسب حرکت تھی...... وہ کم عمر تھی...... اتنی کم عمر اتنی کمزور اتنی کیریکٹرس...... اتنی......'' اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا: ''بتاؤ یار اسے اُردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے...... کیریکٹرس...... لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... وہ اتنی چھوٹی اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی...... ان

چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا............ مجھے اس کا دکھ ہوتا— اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا............ میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا............ میں ایک پیگ اور پیتا ہوں"۔

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے--- میں نے اس سے ایک بار پوچھا: "کیا بات ہے چڈے؟"

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا: "کچھ نہیں............ بات یہ ہے کہ آج وکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی"۔

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

ون کترے نے تھیلما کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا:

"مسٹر منٹو——— وہ ایک دم بلکٹ آدمی تھا——— کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں............ جھوٹ بالکل جھوٹ............ وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا............"

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جڑ بگ بند کیا۔ کئی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر ون کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر بولا: "بکواس بند کر بے ------ ....اور کچھ گا............ لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا"۔

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا، پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی۔ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے............ غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس

کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا: ‘‘حیدر آباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے......... موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے’’۔

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھا لیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا، ان میراثنوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سُروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا: ‘‘بس، اب ختم!’’

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا: ‘‘چلو منٹو چلیں!’’

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا— ‘‘آج کوئی الوداع نہیں کہے گا۔’’

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا: ‘‘ٹھہرو دیکھیں کیا بات ہے’’ مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا: ‘‘اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے’’۔

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا: ‘‘مجھے سخت نیند آ رہی ہے’’۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گیراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: ‘‘ممی چلی گئی!’’

‘‘کہاں؟’’

‘‘معلوم نہیں’’۔ یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔

چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا: ‘‘چلی گئی—— صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا۔’’

میں نے پوچھا: ”مگر کیوں؟“

چڈے کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں ـــــ اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں، اس لئے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔.......... وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے.......... ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت، پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہوگئی اور اس کو تڑی پار کر دیا.......... شہر بدر کر دیا.......... وہ اگر قحبہ تھی۔ دلالہ تھی ـــ اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا۔ ـــ پونہ کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ، اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو۔“ چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا ”مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا ـــ لیکن مجھے افسوس نہیں ہونا چاہئے ـــــ وہ پونہ سے چلی گئی ہے.......... مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی...... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں ـــ زندہ باد ممی.......... زندہ باد! ـــ چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہوگی۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے ـــ وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔“

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں!

☆☆

اللہ دِتّا

دو بھائی تھے۔ اللہ رکھا اور اللہ دتا۔ دونوں ریاست پٹیالہ کے باشندے تھے۔ ان کے آباواجداد البتہ لاہور کے تھے۔ مگر جب ان دو بھائیوں کا دادا ملازمت کی تلاش میں پٹیالہ آیا تو وہیں کا ہو رہا۔

اللہ رکھا اور اللہ دِتا دونوں سرکاری ملازم تھے۔ ایک چیف سکریٹری صاحب بہادر کا اردلی تھا، دوسرا کنٹرولر آف اسٹورز کے دفتر کا چپراسی۔

دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے تاکہ خرچ کم ہو۔ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ ایک صرف اللہ رکھا کو جو بڑا تھا، اپنے چھوٹے بھائی کے چال چلن کے متعلق شکایت تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ رشوت لیتا تھا اور کبھی کبھار کسی غریب اور نادار عورت کو پھانس بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اللہ رکھا نے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا تھا کہ گھر کا امن و سکون درہم برہم نہ ہو۔

دونوں شادی شدہ تھے۔ اللہ رکھا کی دو لڑکیاں تھیں۔ ایک بیاہی جا چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ دوسری جس کا نام صغریٰ تھا، تیرہ برس کی تھی اور پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔

اللہ دتا کی ایک لڑکی تھی ——زینب—— اس کی شادی ہو چکی تھی مگر اپنے گھر میں کوئی اتنی خوش نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس کا خاوند اوباش تھا۔ پھر بھی وہ جوں توں نبھائے جا رہی تھی۔

زینب اپنے بھائی طفیل سے تین سال بڑی تھی۔ اس حساب سے طفیل کی عمر اٹھارہ انیس برس کے قریب ہوتی تھی۔ وہ لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں کام سیکھ رہا تھا۔ لڑکا ذہین تھا؛ چنانچہ کام سیکھنے کے دوران میں بھی پندرہ روپے ماہوار اسے مل جاتے تھے۔

دونوں بھائیوں کی بیویاں بڑی اطاعت شعار، محنتی اور عبادت گزار عورتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ ایکا ایکی ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے دونوں بھائیوں کے

وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کے مال و جان اور عزت آبرو پر حملہ ہوگا اور انہیں افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں ریاست پٹیالہ چھوڑنا پڑے گی— مگر ایسا ہوا۔

دونوں بھائیوں کو قطعاً معلوم نہیں کہ اس خونین طوفان میں کون سا درخت گرا، کون سے درخت سے کون سی ٹہنی ٹوٹی— جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو چند حقیقتیں سامنے آئیں اور وہ لرز گئے۔

اللہ رکھا کی لڑکی کا شوہر شہید کر دیا گیا تھا اور اس کی بیوی کو بلوائیوں نے بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا تھا۔

اللہ دتا کی بیوی کو بھی سکھوں نے کرپانوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ اس کی لڑکی زینب— کا بدچلن شوہر بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

رونا دھونا بیکار تھا۔ صبر شکر کر کے بیٹھ رہے— پہلے تو کیمپوں میں گلتے سڑتے رہے۔ پھر گلی کوچوں میں بھیک مانگا کئے۔ آخر خدا نے سنی۔ اللہ دتا کو گوجرانوالہ میں ایک چھوٹا سا شکستہ مکان سر چھپانے کو مل گیا۔ طفیل نے دوڑ دھوپ کی تو اسے کام مل گیا۔

اللہ رکھا لاہور ہی میں دیر تک دربدر پھرتا رہا۔ جوان لڑکی ساتھ تھی۔ گویا ایک پہاڑ کا پہاڑ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس غریب نے کس طرح ڈیڑھ برس گزارا۔ بیوی اور بڑی لڑکی کا غم وہ بالکل بھول چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی خطرناک قدم اٹھائے کہ اسے ریاست پٹیالہ کے ایک بڑے افسر مل گئے جو اس کے بڑے مہربان تھے۔ اس نے ان کو اپنی حالت زار الف سے لے کر یے تک کہہ سنائی۔ آدمی رحم دل تھا۔ اس کو بڑی دقتوں کے بعد لاہور کے ایک عارضی دفتر میں اچھی ملازمت مل گئی تھی، چنانچہ انہوں نے دوسرے روز ہی اس کو چالیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ اور ایک چھوٹا سا کوارٹر بھی رہائش کے لئے دلوا دیا۔

اللہ رکھا نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی مشکلات دور کیں۔ اب وہ آرام سے سانس لے سکتا تھا اور مستقبل کے متعلق اطمینان سے سوچ سکتا تھا۔ صغریٰ بڑی سلیقے والی سگھڑ لڑکی تھی سارا دن گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ ادھر ادھر سے لکڑیاں چن کے لاتی۔ چولہا سلگاتی اور مٹی کی ہنڈیا میں ہر روز اتنا سالن پکاتی جو دو وقت کے لئے پورا ہو جائے۔ آٹا گوندھتی پاس ہی تنور تھا، وہاں جا کر روٹیاں لگوا لیتی۔

تنہائی میں آدمی کیا کچھ نہیں سوچتا۔ طرح طرح کے خیالات آتے ہیں۔ صغریٰ عام طور پر دن میں تنہا ہوتی تھی اور اپنی بہن اور ماں کو یاد کر کے آنسو بہاتی رہتی تھی، پر جب باپ آتا تو وہ

اپنی آنکھوں میں سارے آنسو خشک کر لیتی تھی تا کہ اس کے زخم ہرے نہ ہوں۔ لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ اس کا باپ اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے۔ اس کا دل ہر وقت روتا رہتا ہے مگر وہ کسی سے کہتا نہیں۔ صغریٰ سے بھی اس نے کبھی اس کی ماں اور بہن کا ذکر نہیں کیا تھا۔

زندگی افتاں و خیزاں گزر رہی تھی۔ ادھر گوجرانوالہ میں اللہ دِتّا اپنے بھائی کے مقابلے میں کسی قدر خوش حال تھا، کیونکہ اسے بھی ملازمت مل گئی تھی اور زینب بھی تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ مل ملا کے کوئی ایک سو روپے ماہوار ہو جاتے تھے جو تینوں کے لئے بہت کافی تھے۔

مکان چھوٹا تھا، مگر ٹھیک تھا۔ اوپر کی منزل میں طفیل رہتا تھا، نچلی منزل میں زینب اور اس کا باپ۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اللہ دِتّا اسے زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ چنانچہ منہ اندھیرے اٹھ کر وہ صحن میں جھاڑو دے کر چولہا سلگا دیتا تھا کہ زینب کا کام کچھ ہلکا ہو جائے وقت ملتا تو وہ دو تین گھڑے بھر کر گھڑونچی پر رکھ دیتا تھا۔

زینب نے اپنے شہید خاوند کو کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس کی زندگی میں کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ خوش تھی۔ اپنے باپ کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بعض اوقات وہ اس سے لپٹ جاتی تھی — طفیل کے سامنے بھی اور اس کو خوب چومتی تھی۔

صغریٰ اپنے باپ سے ایسے چہل نہیں کرتی تھی — اگر ممکن ہوتا تو وہ اس سے پردہ کرتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی نا محرم تھا۔ نہیں — صرف احترام کے لئے — اس کے دل سے کئی دفعہ یہ دعا اٹھتی تھی ''یا پروردگار — میرا باپ میرا جنازہ اٹھائے۔''

بعض اوقات کئی دعائیں الٹی ثابت ہوتی ہیں۔ جو خدا کو منظور تھا، وہی ہونا تھا۔ غریب صغریٰ کے سر پر غم و اندوہ کا ایک اور پہاڑ ٹوٹنا تھا۔

جون کے مہینے دوپہر کو دفتر کے کسی کام پر جاتے ہوئے تپتی ہوئی سڑک پر اللہ رکھا کو ایسی لو لگی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ لوگوں نے اٹھایا۔ ہسپتال پہنچایا مگر دوا دارو نے کوئی کام نہ کیا۔ صغریٰ باپ کی موت کے صدمے سے نیم پاگل ہو گئی۔ اس نے قریب قریب اپنے آدھے بال نوچ ڈالے۔ ہمسایوں نے بہت دم دلاسا دیا۔ مگر یہ کارگر کیسے ہوتا — وہ تو ایسی کشتی کے مانند تھی جس کا بادبان ہو نہ کوئی چپوار اور بیچ منجدھار کے آن پھنسی ہو۔

پٹیالہ کے وہ افسر جنہوں نے مرحوم اللہ رکھا کو ملازمت دلوائی تھی، فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے۔ ان کو جب اطلاع ملی تو دوڑے آئے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ کام کیا کہ صغریٰ کو موٹر میں بٹھا کر گھر چھوڑ آئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پھر ہسپتال جا کر انہوں نے

اللہ رکھا کے غسل وغیرہ کا وہیں انتظام کیا اور دفتر والوں سے کہا کہ وہ اس کو دفنا آئیں۔

اللہ دتا کو اپنے بھائی کے انتقال کی خبر بڑی دیر کے بعد ملی۔ بہر حال، وہ لاہور آیا اور پوچھتا پاچھتا وہاں پہنچ گیا جہاں صغریٰ تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی کو بہت دم دلاسا دیا۔ بہلایا۔ سینے کے ساتھ لگایا۔ پیار کیا۔ دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا۔ بہادر بننے کو کہا، مگر صغریٰ کے پھٹے ہوئے دل پر ان تمام باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ غریب خاموش اپنے آنسو دوپٹے میں خشک کرتی رہی۔

اللہ دِتا نے افسر صاحب سے آخر میں کہا: ''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ میری گردن آپ کے احسانوں تلے ہمیشہ دبی رہے گی۔ مرحوم کی تجہیز وتکفین کا آپ نے بندوبست کیا۔ پھر یہ بچی جو بالکل بے آسرا رہ گئی تھی، اس کو آپ نے اپنے گھر میں جگہ دی—— خدا آپ کو اس کا اجر دے——اب میں اسے اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ میرے بھائی کی بڑی قیمتی نشانی ہے''

افسر صاحب نے کہا: ''ٹھیک ہے—— لیکن تم ابھی اسے کچھ دیر اور یہاں رہنے دو—— طبیعت سنبھل جائے تو لے جانا۔''

اللہ دتا نے کہا'' حضور! میں نے ارادہ کیا ہے کہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کروں گا اور بہت جلد!''

افسر صاحب بہت خوش ہوئے: ''بڑا نیک ارادہ ہے—— لیکن اس صورت میں جب کہ تم اس کی شادی اپنے لڑکے سے کرنے والے ہو، اس کا اس گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ تم شادی کا بندوبست کرو۔ مجھے تاریخ سے مطلع کر دینا۔ خدا کے فضل وکرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

بات درست تھی۔ اللہ دِتا واپس گوجرانوالہ چلا گیا۔ زینب اس کی غیر موجودگی میں بڑی اداس ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی۔

اللہ دِتا نے پیار سے اسے ایک طرف ہٹایا: ''ارے بابا، آنا جانا کیا ہے—— قبر پر فاتحہ پڑھنی تھی۔ صغریٰ سے ملنا تھا، اسے یہاں لانا تھا۔

زینب نہ معلوم کیا سوچنے لگی ''صغریٰ کو یہاں لانا تھا'' ایک دم چونک کر: ''ہاں—— صغریٰ کو یہاں لانا تھا۔ پر وہ کہاں ہے؟''

''وہیں ہے—— پٹیالے کے ایک بڑے نیک دل افسر ہیں، ان کے پاس ہے۔ انہوں نے کہا جب تم اس کی شادی کا بندوبست کر لو گے تو لے جانا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیڑی سلگائی۔

زینب نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا: ''اس کی شادی کا بندوبست کر رہے ہو——

کوئی لڑکا ہے تمہاری نظر میں؟''

اللہ دتا نے زور کا کش لیا: ''ارے بھئی اپنا طفیل — میرے بڑے بھائی کی صرف ایک ہی نشانی تو ہے — میں اسے کیا غیروں کے حوالے کردوں گا۔''

زینب نے ٹھنڈی سانس بھری: ''تو صغریٰ کی شادی تم طفیل سے کروگے؟''

اللہ دتا نے جواب دیا: ''ہاں — کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''

زینب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا: ''ہاں — اور تم جانتے ہو، کیوں ہے — یہ شادی ہرگز نہیں ہوگی!''

اللہ دتا مسکرایا۔ زینب کی ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا منہ چوما: ''پگلی — ہر بات پر شک کرتی ہے — اور باتوں کو چھوڑ، آخر میں تمہارا باپ ہوں۔''

زینب نے بڑے زور سے ہونہہ کی ''باپ!'' اور اندر کمرے میں جا کر رونے لگی۔ اللہ دتا اس کے پیچھے گیا اور اس کو پچکارنے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ طفیل فرمانبردار لڑکا تھا۔ جب اس کے باپ نے صغریٰ کی بات کی تو وہ فوراً مان گیا۔ آخر تین چار مہینے کے بعد تاریخ مقرر ہوگئی — افسر صاحب نے فوراً صغریٰ کے لئے ایک بہت اچھا جوڑا سلوایا جو اسے شادی کے دن پہننا تھا۔ ایک انگوٹھی بھی لے دی۔ پھر اس نے محلے والوں سے اپیل کی کہ وہ ایک یتیم لڑکی کی شادی کے لئے جو بالکل بے سہارا ہے، حسب توفیق کچھ دیں۔

صغریٰ کو قریب قریب سبھی جانتے تھے اور اس کے حالات سے واقف تھے، چنانچہ انہوں نے مل ملا کر اس کے لئے بڑا اچھا جہیز تیار کردیا۔

صغریٰ دلہن بنی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ تمام دکھ جمع ہو گئے ہیں اور اس کو پیس رہے ہیں۔ بہرحال، وہ اپنے سسرال پہنچی جہاں اس کا استقبال زینب نے کیا، کچھ اس طرح کہ صغریٰ کو اسی وقت معلوم ہوگیا کہ وہ اس کے ساتھ بہنوں کا سا سلوک نہیں کرے گی بلکہ ساس کی طرح پیش آئے گی۔

صغریٰ کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی ابھی اچھی طرح اترنے بھی نہیں پائی تھی کہ زینب نے اس سے نوکروں کے کام لینے شروع کردیے۔ جھاڑو وہ دیتی۔ برتن وہ مانجھتی۔ چولہا وہ جھونکتی۔ پانی وہ بھرتی۔ یہ سب کام وہ بڑی پھرتی اور بڑے سلیقے سے کرتی، لیکن پھر بھی زینب خوش نہ ہوتی۔ بات بات پر اس کو ڈانٹتی ڈپٹتی، جھڑکتی رہتی۔

صغریٰ نے دل میں تہیہ کرلیا تھا، وہ یہ سب کچھ برداشت کرے گی اور کبھی حرف شکایت

زبان پر نہ لائے گی، کیونکہ اگر اسے یہاں سے دھکا مل گیا تو اس کے لئے اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

اللہ دتا کا سلوک البتہ اس سے برا نہیں تھا۔ زینب کی نظر بچا کر کبھی کبھی وہ اس کو پیار کر لیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ کچھ فکر نہ کرے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

صغریٰ کو اس سے بہت ڈھارس ہوتی۔ زینب جب کبھی اپنی کسی سہیلی کے ہاں جاتی اور اللہ دتا اتفاق سے گھر پر ہوتا تو وہ اس سے دل کھول کر پیار کرتا۔ اس سے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ کام میں اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے واسطے اس نے جو چیزیں چھپا کر رکھی ہوتی تھیں، دیتا اور سینے کے ساتھ لگا کر اس سے کہتا: ”صغریٰ، تم بڑی پیاری ہو!“

صغریٰ جھینپ جاتی۔ دراصل وہ اتنے پرجوش پیار کی عادی نہیں تھی اس کا مرحوم باپ اگر کبھی اسے پیار کرنا چاہتا تھا تو صرف اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا دیا کرتا تھا: ”خدا میری بیٹی کے نصیب اچھے کرے۔“

صغریٰ طفیل سے بہت خوش تھی۔ وہ بڑا اچھا خاوند تھا۔ جو کماتا تھا، اس کے حوالے کر دیتا تھا، مگر صغریٰ زینب کو دے دیتی تھی، اس لئے کہ وہ اس کے قہر و غضب سے ڈرتی تھی۔

طفیل سے صغریٰ نے زینب کی بدسلوکی اور اس کے ساس ایسے برتاؤ کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ صلح کل تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باعث گھر میں کسی قسم کی بدمزگی پیدا ہو۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو وہ طفیل سے کہنا چاہتی تو کہہ دیتی مگر اسے ڈر تھا کہ طوفان برپا ہو جائے گا۔ اور تو اس میں سے بچ کر نکل جائیں گے مگر وہ اکیلی اس میں پھنس جائے گی، اور اس کی تاب نہ لا سکے گی۔

یہ خاص باتیں اسے چند روز ہوئے معلوم ہوئی تھیں اور وہ کانپ کانپ گئی تھی۔ اب اللہ دتا اسے پیار کرنا چاہتا تو وہ الگ ہٹ جاتی، یا دوڑ کر اوپر چلی جاتی، جہاں وہ اور طفیل رہتے تھے۔ طفیل کو جمعہ کی چھٹی ہوتی تھی۔ اللہ دتا کو اتوار کی۔ اگر زینب گھر پر ہوتی تو وہ جلدی جلدی کام کاج ختم کر کے اوپر چلی جاتی۔ اگر اتفاق سے اتوار کو زینب کہیں باہر گئی ہوتی تو صغریٰ کی جان پر بنی رہتی۔ ڈر کے مارے اس سے کام نہ ہوتا، لیکن زینب کا خیال آتا تو اسے مجبوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل سے طوعاً و کرہاً سب کچھ کرنا پڑتا۔ اگر وہ کھانا وقت پر نہ پکائے تو اس کا خاوند بھوکا رہے کیونکہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنا شاگرد روٹی کے لئے بھیج دیتا تھا۔

ایک دن اتوار کو جب کہ زینب گھر پر نہیں تھی، اور وہ آٹا گوندھ رہی تھی، اللہ دتا پیچھے سے دبے پاؤں آیا اور کھلنڈرے انداز میں اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ وہ تڑپ کر اٹھی، مگر اللہ دتا نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

صغریٰ نے چیخنا شروع کر دیا مگر وہاں سننے والا کون تھا۔ اللہ دتا نے کہا: ''شور مت مچاؤ۔ یہ سب بے فائدہ ہے — چلو آؤ!''

وہ چاہتا تھا کہ صغریٰ کو اٹھا کر اندر لے جائے۔ کمزور تھی مگر خدا جانے اس میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ اللہ دتا کی گرفت سے نکل گئی اور ہانپتی کانپتی اوپر پہنچ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آ گئی۔ اللہ دتا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اندر کمرے میں لیٹ کر اس نے زینب کو پکارا۔ وہ آئی تو اس سے کہا: ''ادھر آؤ، میری ٹانگیں دباؤ — زینب اُچک کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی ٹانگیں دبانے لگی — تھوڑی دیر کے بعد دونوں کے سانس تیز تیز چلنے لگے۔

زینب نے اللہ دتا سے پوچھا ''کیا بات ہے؟ آج تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔''

اللہ دتا نے سوچا کہ زینب سے چھپانا فضول ہے، چنانچہ اس نے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ زینب آگ بگولا ہو گئی: ''کیا ایک کافی نہیں تھی — تمہیں تو شرم نہ آئی پر اب تو آنی چاہئے تھی — مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہوگا، اسی لئے میں شادی کے خلاف تھی — اب سن لو کہ صغریٰ اس گھر میں نہیں رہے گی!''

اللہ دتا نے بڑے مسکین لہجے میں پوچھا ''کیوں؟''

زینب نے کھلے طور پر کہا: ''میں اس گھر میں اپنی سوت دیکھنا نہیں چاہتی!''

اللہ دتا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکل نہ سکی۔

زینب باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ صغریٰ صحن میں جھاڑو دے رہی ہے۔ چاہتی تھی کہ اس سے کچھ کہے مگر خاموش رہی۔

اس واقعے کو دو مہینے گزر گئے — صغریٰ نے محسوس کیا کہ طفیل اس سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آخر ایک دن آیا کہ اس نے طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں دیا اور گھر سے باہر نکال دیا۔

☆☆

شانتی

دونوں بیرے ڑین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی۔ اس لئے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے۔ سامنے موٹی بھوؤں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرا تیکھی ناک موٹے موٹے بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ۔ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بلراج سے کہا ”بیٹھی ہے جال پھینکنے۔“

بلراج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی۔“

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی۔ ”یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے کوئی دکان کھول کر بیٹھتی ہے۔ کوئی چل پھر کے سودا بیچتی ہے۔ کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے— جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے۔ اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے— یہ موٹی بھوؤں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہوگی کہ وہ بکاؤ ہے۔“

بلراج مسکرایا۔ ”کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیوں کر سودے ہوتے ہیں۔ اس جنس کا بھاؤ کیسے چکتا ہے۔“ یہ کہہ کر ایک دم اس نے مقبول کا ہاتھ پکڑا۔ ”اِدھر دیکھو، اِدھر“

مقبول نے موٹی یہودن کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”نہیں یار— ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو۔“

مقبول نے اُدھر دیکھا۔ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھ رہی تھی بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا۔ ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا۔ ”کون ہے یہ لڑکی؟“

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ’’اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب و غریب ہے۔‘‘

مقبول نے کچھ دیر سوچا پھر کہا ’’کون سی یار۔ تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب و غریب ہی ہوتی ہے۔‘‘

بلراج مسکرایا۔ ’’یہ بڑی خاص الخاص ہے — ذرا غور سے دیکھو۔‘‘

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز۔ پتلی پتلی بہت ہی گوری بانہیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی۔ ’’میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے — اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑی کی پہناوٹ میں بھی خامیاں نظر آئی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں۔‘‘

بلراج ہنسا۔ ’’تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی۔‘‘

مقبول نے کہا جو اچھائیاں ہیں وہ اب بیان فرما دیجئے، لیکن پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا —‘‘

لڑکی نے جب بلراج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا۔ ’’مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجئے۔‘‘

سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اصول اس نے اپنے لئے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے۔ پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے۔‘‘

بلراج نے چائے کا آخری گھونٹ پیا ’’کہئے کیا خیال ہے؟‘‘

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا ’’جو خوبیاں تم نے بتائی ہے ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں۔ جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی — خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔‘‘

’’یہی میں نے سوچا تھا — میں تم سے کیا بیان کروں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔ اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں — ایک گھنٹہ ہو گیا۔ تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی — میں چلی، اور یہ جا وہ جا — تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے جاؤ —

ساڑی کو ہاتھ مت لگاؤ، میلی ہو جائے گی۔“ یہ کہہ کر بلراج نے سگریٹ سلگایا۔ ”عجیب وغریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ففٹی سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا، جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔“

مقبول نے پوچھا۔ ”نام کیا ہے اس کا۔“

”شانتی بتایا اس نے — کشمیرن ہے“

مقبول کشمیری تھا۔ چونک پڑا۔ ”کشمیرن!“

”تمہاری ہم وطن“

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا۔ یہاں کیسے آئی؟“

”معلوم نہیں!“

”کوئی رشتے دار ہے اس کا“؟ مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

”وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے۔“ بلراج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا۔ ہارنبی روڈ پر ایک ہوٹل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے — یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہو گیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتہ کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں ہیرے ڈین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں!“

مقبول کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لئے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کی پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مقبول بلراج سے مخاطب ہوا۔ ”اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیے۔“

بلراج مسکرایا۔ ”ضرور ضرور — لیکن اس وقت نہیں۔ مصروف ہے۔ کبھی آ جانا یہاں شام کو — اور ساتھ بیٹھ جانا۔“

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چائے کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری۔ چال بھدی تھی۔ جب وہ کچھ دور کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا۔ ”اس میں جنسی کشش تو نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے — لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے — ساڑی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چائے میز پر آ چکی تھی۔ ورنہ اٹھ کر وہ اس

لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اس نے چائے پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔ ”چائے شوق فرمائیں گی آپ۔“

”نہیں۔“

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”کشمیریوں کو تو چائے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔“

لڑکی نے بڑے بے ہنگم انداز میں پوچھا۔ ”تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ۔“

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ ”ہاں—“

لڑکی نے کہا۔ ”ففٹی روپیز — یس اور نو؟“

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لئے ”چلئے!“

مقبول نے چائے کا بل ادا کیا۔ دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا۔ ”کہاں جائے گا تم؟“

مقبول نے جواب دیا۔ ”جہاں لے جاؤ گی۔“

ہم کچھ نہیں جانتا — تم بولو کدھر جائے گا؟“

مقبول کو کوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا۔ ”ہم کچھ نہیں جانتا!“

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا۔ ”تم کیسا آدمی ہے — خالی پیلی جوک کرتا ہے۔“

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ”میں مذاق نہیں کرتا — مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں۔“

وہ بگڑ کر بولی کیا — تم تو بولا تھا ففٹی روپیز یس!“

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ”یہ لو گھبراتی کیوں ہو۔“

اس نے نوٹ لے لئے۔ ”تم جائے گا کہاں“

مقبول نے کہا۔ ”تمہارے گھر“

”نہیں“

”کیوں نہیں“

"تم کو بولا ہے نہیں — ادھر ایسی بات نہیں ہوگی۔"

مقبول مسکرایا۔ "ٹھیک ہے۔ ایسی بات ادھر نہیں ہوگی۔"

وہ کچھ متحیر سی ہوئی۔ "تم کیسا آدمی ہے۔"

"جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا ففٹی روپیز لیس کے نو — میں نے کہا یس اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیئے۔ تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہوگی — اب اور کیا کہتی ہو۔"

لڑکی سوچنے لگی۔ مقبول مسکرایا۔ "دیکھو شانتی، بات یہ ہے کل تم کو دیکھا۔ ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا کیا تمہیں یہ منظور نہیں۔"

"نہیں — یہ لو اپنے ففٹی روپیز" لڑکی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔

"تمہیں بس ففٹی روپیز کی پڑی ہے —— روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں — چلو، ڈرائیور کو اپنا اڈریس بتاؤ —— میں شریف آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔" مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی۔ لڑکی متاثر ہوئی اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ "چلو — ڈرائیور ہاربی روڈ!"

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیئے۔ "یہ میں نہیں لوں گی۔"

مقبول نے اصرار نہ کیا۔ "تمہاری مرضی!"

"ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رُکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے تھے۔ تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لئے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ ایک کونے میں ڈریسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول اس پر ٹیبل فین، چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دونوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا۔ "نہیں — ادھر بیٹھنے کا اجازت نہیں — ہم کسی کو اپنے بستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو۔" یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا۔ "بولو —— کیا باتیں کرنا

چاہتے ہو؟"

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی۔"

شانتی نے برا نہ مانا۔ صرف اتنا کہا۔ "مجھے مالوم ہے۔"

"اٹھو۔ مجھے لپ اسٹک دو میں تمہیں سکھاتا ہوں" یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا۔ "ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھالو۔"

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ "ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں۔"

"تمہارے رومال سے نہیں — میرا لو۔" یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دُھلا ہوا رومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سرخی اس پر لگائی۔ پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا۔ لو اب آئینہ دیکھو۔"

شانتی اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا۔ "اب ٹھیک ہے" پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا "تمہارا کوئی بیوی ہے؟"

مقبول نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

کچھ دیر خاموش رہی۔ مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں۔ چنانچہ اس نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔ "اتنا تو مجھے معلوم ہے تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو — یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟"

شانتی نے بے تکلف جواب دیا۔ "میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے — میں وہاں ہوسپٹل میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا — میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا — بولا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گیا۔ بس کام چالو ہوگیا — ہم یہاں ہوٹل میں آگیا — پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتی — سب رنڈی لوگ ہے — کسی کو یہاں نہیں آنے دیتی۔"

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتہ چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "آئی ڈونٹ لائک دیٹ از بیڈ۔"

اس کے نزدیک ففٹی روپیز کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سری نگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے۔ شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا — چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لئے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچائے ہوتے مگر اسکو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے۔

اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی۔ ”ہم اپنا لوس پورا کر لے گا۔“

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بینک میں جمع کرا دیئے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا۔ ”اب تم جاؤ — ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا۔“ مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے کہا۔ ”باتیں کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتا ہے۔“

مقبول نے ”اچھا“ کہا اور چل دیا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی۔ مگر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی۔ ایک ایسے مقام پر ٹھہر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت، عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے خلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔

شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لئے مقبول نے اسے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارت نہیں کرتی تھی۔ لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا۔ جب شانتی نے اس سے کہا۔ ”تم کوئی لڑکی مانگتا؟“

مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا۔ ’’کیا کہا؟‘‘

شانتی نے کہا۔ ’’ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لا کر دیتا۔‘‘

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جب کہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے صرف باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا مجھ جیسی ساری عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے، کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک دم وہ اٹھی اور چلّانے لگی ’’ہم کچھ بھی نہیں ہے — جاؤ چلے جاؤ — ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم — جاؤ۔‘‘

مقبول نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے ژین ڈیری جاتا رہا۔ مگر شانتی دکھائی نہ دی۔ آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا — شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی پرانا تھا۔ ساڑی کی پہناوٹ اور زیادہ بدزیب تھی مقبول اس سے مخاطب ہوا۔ ’’مجھ سے ناراض ہو تم؟‘‘

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تند لہجے میں پوچھا۔ ’’بھول گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟‘‘

شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصّے میں کہا۔ ’’جواب دو ورنہ یاد رکھو ماروں گا۔‘‘

شانتی نے صرف اتنا کہا۔ ’’مارو۔‘‘

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا — شانتی بلبلا اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصّے میں اس کے ہونٹوں کی بھدی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے، پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ’’ساڑی ٹھیک کرو اپنی۔‘‘

شانتی اٹھی اور ساڑی ٹھیک کرنے لگی۔ مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا۔ ’’شانتی اٹھو — میں جا رہا ہوں۔‘‘

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلّائی۔ ''نہیں نہیں — تم نہیں جا سکتے۔'' اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہوگئی۔ ''تم گیا تو مار ڈالوں گی۔''

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا، رونا بند کرنے کے لئے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی۔ ''ادھر سری نگر میں — ایک آدمی نے — ہم کو مار دیا — ادھر ایک آدمی نے — ہم کو زندہ کر دیا۔''

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا۔ ''یہ لو اپنے ففٹی روپیز۔''

شانتی نے بڑے غصّے اور نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیئے۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کا ایک دروازہ کھولا اور مقبول سے کہا۔ ''ادھر — دیکھو یہ کیا ہے؟''

مقبول نے دیکھا دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹھی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے۔ ''ہم اب یہ نہیں مانگتا!''

مقبول مسکرایا۔ ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر ایک چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا۔ ''اب تم کیا مانگتا ہے؟''

شانتی نے جواب دیا۔ ''تم کو'' یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ ''روؤ نہیں — تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔''

کتابیات

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنف
1۔	منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو
2۔	افسانے اور ڈرامے	سعادت حسن منٹو
3۔	چند	سعادت حسن منٹو
4۔	یزید	سعادت حسن منٹو
5۔	نمرود کی خدائی	سعادت حسن منٹو
6۔	خالی بوتلیں خالی ڈبے	سعادت حسن منٹو
7۔	سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو
8۔	بادشاہت کا خاتمہ	سعادت حسن منٹو
9۔	سرکنڈوں کے پیچھے	سعادت حسن منٹو
10۔	برقعے	سعادت حسن منٹو
11۔	دھواں	سعادت حسن منٹو
12۔	ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو
13۔	سیاہ حاشیے	سعادت حسن منٹو
14۔	تلخ ترش شیریں	سعادت حسن منٹو
15۔	اوپر نیچے	سعادت حسن منٹو
16۔	پھندنے	سعادت حسن منٹو

17-	شکاری عورتیں	سعادت حسن منٹو
18-	تین عورتیں	سعادت حسن منٹو
19-	گنجے فرشتے	سعادت حسن منٹو
20-	لاؤڈ اسپیکر	سعادت حسن منٹو
21-	زحمت مہر درخشاں	سعادت حسن منٹو
22-	منٹو کی بہترین کہانیاں	سعادت حسن منٹو
23-	کالی شلوار	سعادت حسن منٹو
24-	منٹو کے مضامین	سعادت حسن منٹو
25-	جنازے	سعادت حسن منٹو
26-	کروٹ	سعادت حسن منٹو
27-	نور جہاں سرور جان	سعادت حسن منٹو
28-	ویرا (ترجمہ)	سعادت حسن منٹو
29-	سرگزشت اسیر (ترجمہ)	سعادت حسن منٹو
30-	گورکی کے افسانے (ترجمہ)	سعادت حسن منٹو
31-	منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو
32-	آؤ	سعادت حسن منٹو
33-	عصمت چغتائی	سعادت حسن منٹو
34-	لذت سنگ	سعادت حسن منٹو
35-	داستان سے افسانے تک	وقار عظیم
36-	فن افسانہ نگاری	وقار عظیم
37-	ہمارے افسانے	وقار عظیم
38-	روشنائی	سید سجاد ظہیر
39-	تحقیق وتنقید	ڈاکٹر اختر اورینوی

40-	منظر اور پس منظر	ڈاکٹر اختر اورینوی
41-	ترقی پسند ادب	سردار جعفری
42-	ترقی پسند ادب	عزیز احمد
43-	منٹو	ابو سعید قریشی
44-	مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین
45-	اصول افسانہ نگاری	اویس احمد ادیب
46-	اردو کی نثری داستان	گیان چند جین
47-	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور
48-	ادب میں ترقی پسندی	گوپال متل
49-	کسوٹی	اختر اورینوی
50-	اردو زبان میں فن داستان گوئی	کلیم الدین احمد
51-	تنقیدی حاشیے	مجنوں گورکھپوری
52-	تنقیدی جائزے	اختشام حسین
53-	تنقیدی اشارے	آل احمد سرور
54-	دنیائے افسانہ	عبدالقادر سروری
55-	ناول کیا ہے؟	احسن فاروقی
56-	ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی
57-	سعادت حسن منٹو	محمد محسن

☆☆

رسائل

1۔	نقوش	افسانہ نمبر	1957ء
2۔	نقوش	شخصیات نمبر	1955ء
3۔	نیا ادب		
4۔	انگارے		1936ء
5۔	شاعر	منٹو نمبر	1955ء
6۔	نقوش	منٹو نمبر	1956ء
7۔	روبی	منٹو نمبر	1977ء
8۔	آجکل	جون	1983ء

☆☆☆

SAADAT HASAN MANTO
HAYAT AUR AFSANE

by

Dr. Farzana Aslam

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091 -11- 23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-486-4